جلد ۶۱ مئی ۱۹۶۶ء عدد ۲

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

زرسالانہ: سات روپے
فی پرچہ: ۶۵ پیسے

ترجمان القرآن، لاہور

فہرست مضامین

جلد ۷۱	مئی ۱۹۶۹ء مطابق، صفر ۱۳۸۹ھ ہجری	عدد ۳

چندہ سالانہ	ماہنامہ ترجمان القرآن،	فی پرچہ
سات روپے	۵-اے ذیلدار پارک، اچھرہ-لاہور	۷۵ پیسے

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ، لاہور سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

دانشمند انسانوں کا قاعدہ ہے کہ سفر شروع کرنے سے پہلے منزلِ مقصود کا تعیّن کرتے ہیں، اور پھر اسی کے لحاظ سے سفر کا سر و سامان کیا کرتے ہیں۔ بلا تعیّنِ مقصد یونہی چل پڑنا کسی عقل مند کا کام نہیں ہو سکتا، اور تعیّنِ مقصد کے بعد ان ذرائع و وسائل کو بہم پہنچانے کی فکر نہ کرنا جو منزلِ مقصود تک پہنچانے کے لیے ضروری ہوں صرف نادان لوگوں ہی کا کام ہے۔

بالکل یہی معاملہ ان قوموں، جماعتوں اور افراد کا ہے جو کسی ولولے اور امنگ کے ساتھ اٹھیں اور آگے بڑھنے کی کوشش کریں۔ محض جوش و خروش، متحرک رہنے کی مجرّد خواہش اور آگے بڑھنے کا صرف ذوق بے معنی ہے اگر یہ نصب العین کے تعیّن کے بغیر ہو۔ کسی فرد یا جماعت کے لیے یہ طرزِ عمل کسی طرح بھی سُود مند نہیں ہو سکتا بلکہ اُلٹا ضرر رساں ہوتا ہے، کیونکہ اُس میں جس قدر زیادہ قوّتِ عمل ہو گی اور اس قوّت کو بروئے کار لانے کا جتنا زیادہ جذبہ ہو گا، منزلِ مقصود سامنے نہ ہونے کے باعث وہ فرد یا جماعت اسی نسبت سے فکر و عمل کے اعتبار سے زیادہ پریشان ہو گی اور اس کی قوتیں زیادہ تیزی سے ضائع ہوں گی۔ بے مقصد جدوجہد کبھی بھی نتیجہ خیز نہیں ہوتی اور نصب العین کے تعیّن کے بغیر تگ و دو بجز سراسیمگی اور پریشانی کے اور کوئی چیز اپنے جلو میں نہیں لاتی۔ جماعتوں اور قوموں کو جدوجہد شروع کرنے سے پہلے اس امر کا فیصلہ کرنا چاہیے کہ وہ اپنی تگ و دَو سے کیا مقاصد حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ مقاصد کے تعیّن کے بعد ہی وہ آزاد سفر کا معقول بندوبست کر سکتی ہیں اور اس امر کا اندازہ لگا سکتی ہیں کہ انہیں جس راہ پر گامزن ہونا ہے اس کی کیا دشواریاں ہیں اور ان دشواریوں کو دُور کرنے کے لیے انہیں کس نوعیت کے انتظامات کرنے کی ضرورت ہے۔

▶ پاکستانی قوم اگر دنیا میں عزت و آبرو کی زندگی بسر کرنا چاہتی ہے اور اپنی صلاحیتوں کو تعمیر و ترقی کی راہ پر لگانے کا عزم رکھتی ہے تو اسے سب سے پہلے یہ طے کرنا چاہیے کہ اس کی زندگی کا مقصد کیا ہے۔ پھر اس مقصد کی روشنی میں پوری صورتِ حال کا جائزہ لے کر اسے یہ دیکھنا چاہیے کہ اُسے اس وقت کون سے مسائل درپیش ہیں اور اہمیت کے اعتبار سے ان کی کس طرح درجہ بندی کی جا سکتی ہے اور اس کے بعد انہیں حل کرنے کے لیے کن عملی اقدامات کی ضرورت ہے۔ مگر اسے اس قوم کی بدبختی کے سوا اور کس چیز پر محمول کیا جا سکتا ہے کہ اہلِ پاکستان قیامِ ملک کے کچھ عرصہ بعد ہی اس سیدھی اور معقول روش کو اختیار کرنے سے گریز کرنے لگے اور اپنی صلاحیتوں کو بے مقصد جد و جہد میں کھپانے لگے۔ نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔

یہ قوم آج سے بائیس سال پیشتر پوری دنیا کے سامنے یہ دعویٰ لے کر اٹھی تھی کہ اس کا ایک الگ وطن کے لیے مطالبہ کچھ جوعِ ارضی کی وجہ سے نہیں بلکہ اس وجہ سے ہے کہ اس کے پاس ایک ایسا انقلاب انگیز نظامِ حیات ہے جو پوری نوعِ انسانی کو حقیقی سکون اور اطمینان عطا کر سکتا ہے۔ اس نظام کے عملی مضمرات ذہن نشین کرانے اور واقعات کی دنیا میں اس کی خوبیاں اُجاگر کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ کوئی ایک ایسا خطۂ ارضی موجود ہو جس میں اس نظام کو بروئے کار لا کر انسانوں کو اس کی عملی صورت دکھائی جا سکے۔ اس مطالبے میں اتنی معقولیت اور اس میں اتنی دلکشی تھی کہ یہ مطالبہ پوری مسلم قوم کے دل کی دھڑکن بن گیا اور ہندوستان کے سارے مسلمانوں نے دنیوی مفادات کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے اس کی ہمنوائی کی اور انگریز اور ہندو کی مزاحمت کے علی الرغم پاکستان کی شکل میں کرۂ ارضی پر ایک نیا ملک نمودار ہوا۔ لیکن جب یہ سب کچھ ہو چکا تو کچھ لوگ اُٹھے اور انہوں نے اس نصب العین ہی کے معاملہ میں اس قوم کے ذہن کو پراگندہ کرنا شروع کر دیا۔ یہ لوگ ہر راستے سے آئے۔ حکومت اور اقتدار کے راستے سے بھی آئے، سیاسی قیادت کے راستے سے بھی، صحافت اور ادب اور ذرائع نشر و اشاعت کے راستے سے بھی آئے، درس گاہوں کے راستے سے بھی آئے اور کسان مزدور تحریکوں اور صوبہ پرستی اور نسلی و لسانی تفرقوں کے راستے سے بھی آئے۔ اِن لوگوں نے ۲۰ سال اس کوشش میں صرف کر دیے کہ یہ قوم اس اصل مقصد ہی کو بھول جائے جس کے لیے پاکستان وجود میں آیا تھا، بلکہ یہ کسی مقصد پر بھی متفق و متحد نہ ہو سکے۔ یہ وہ ظلمِ عظیم تھا جس نے پاکستان کے وجود ہی کو سرے سے بے معنی

بنا کر رکھ دیا۔

کہنے کو تو پاکستان محض زمین کا ایک ٹکڑا ہے مگر یہ ملک جس مقدس عزم اور بلند مقصد کے ساتھ حاصل کیا گیا، جس حیات آفریں پیغام کی صورت میں اس کی اہمیت مسلمانوں کے ذہن نشین کرائی گئی، اور جس روحانی اور اخلاقی نظام حیات کی برتری ثابت کرنے کے لیے مسلم قوم کو اس کے مطالبے پر اُبھارا گیا، وہ وطنیت اور قومیت کے سارے فلسفوں سے مختلف ہے۔ الگ وطن کا تقاضا عام طور پر کسی خاص قوم کی سیاسی برتری اور تفوق قائم کرنے، اس کے لیے قدرتی وسائل سے حسب منشا فائدہ اٹھانے اور قوم کے افراد کے لیے اُونچے عہدوں پر قبضہ جمانے کے لیے کیا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں وطن کے قیام کے پیچھے بجز مادی اور قومی اغراض کے کوئی دوسری غرض پوشیدہ نہیں ہوتی۔ مگر تحریکِ پاکستان جب اٹھائی گئی اس وقت مسلم قوم کے سامنے ان چیزوں میں سے کوئی چیز بھی نہ تھی۔ اس تحریک کا محرک ایک ہی جذبہ تھا اور وہ یہ کہ انسان کو انسان کی غلامی سے نجات دلائی جائے اور اُسے اس غرض کے لیے آزاد کرایا جائے کہ وہ اپنے رب کے دیئے ہوئے نظامِ حیات کی پیروی کر سکے۔ قوم پرستی، وطن پرستی، مادیت پرستی اور استعماریت کے اس دَور میں پاکستان کا مطالبہ اس بنا پر عجیب و غریب تھا کہ دنیا میں ایک قوم ایسی بھی ہے جو سیاسی اور معاشی مصالح کے تحت نہیں بلکہ اخلاقی، روحانی اور دینی تقاضوں کے تحت ایک الگ خطۂ زمین کے حصول کی آرزومند ہے اور اس بات کا بانگِ دہل اعلان کر رہی ہے کہ اگر اس کی یہ آرزو پُوری ہو گئی تو وہ اس میں مُسلم قوم کی خدائی قائم کرنے کے بجائے مالک الملک کی کبریائی قائم کرے گی اور ان سارے فرائض کو خوشدلی کے ساتھ سرانجام دے گی جو بندگیٔ رب کے سلسلے میں اس پر عائد ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں وہ سب سے پہلے ان سارے بُتوں کو پاش پاش کرے گی جن کی غیر اسلامی عصبیتوں نے صورت گری کی ہے۔ رنگ، نسل اور زبان کے تعصبات کو وہ خود اپنے پاؤں سے پامال کرے گی، جاہلیت کی رسموں کے بندھن خود اپنے ہاتھ سے توڑے گی اور اپنے عمل کے ذریعے دنیا میں یہ حقیقت ثابت کرے گی کہ انسان اور انسان کے مابین تعلق کی بنیاد مادّی نہیں بلکہ سراسر رُوحانی اور اخلاقی ہے۔

یہ اسی دعوے کی صداقت کا بین ثبوت تھا کہ پاکستان کے قیام کے لیے سب سے بڑھ کر اُن مسلمانوں نے بے مثال قربانیاں دیں جو یہ توقع کر ہی نہ سکتے تھے کہ ان کا علاقہ بھی پاکستان میں شامل ہو گا، اور جن کے لیے اس امید کی کوئی گنجائش نہ تھی کہ پاکستان کے قیام سے انہیں کوئی مادی منفعت حاصل ہو گی، بلکہ وہ جانتے تھے کہ اس جدوجہد کا بہت بُرا خمیازہ انہیں بھگتنا پڑے گا۔

پھر ملک کا جو نقشہ سامنے آیا وہ خود پاکستانی قومیت کی اس رُوحانی اور اخلاقی اساس کی شہادت فراہم کر رہا ہے۔ ملک کے دونوں بازوؤں کے درمیان ایک ہزار میل سے زیادہ کا فاصلہ حائل ہے۔ اس لیے جغرافیائی یک جہتی کی بنیاد پر ایک قوم اور ایک ملک بننے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس علاقائی بُعد کے علاوہ دونوں صوبوں کے باشندوں کے درمیان رنگ، نسل، زبان اور طرزِ معاشرت کے اعتبار سے بھی کافی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ جہاں تک مغربی پاکستان کا تعلق ہے اس میں بھی زبان اور طرزِ معاشرت کی وحدت کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ مگر ان سارے اختلافات کے باوجود اسلام کی مقناطیسی قوت نے اس ملک کے سارے اجزاء کو ایک دوسرے سے پیوست کر دیا۔ بنگالی، پنجابی، سندھی، پٹھان اور بلوچی مختلف علاقوں اور نسلوں سے تعلق رکھنے اور مختلف زبانیں بولنے کے باوجود اپنے آپ کو اسلام کی وسیع تر برادری کا رُکن سمجھنے لگے اور اسی بنیاد پر ایک دوسرے سے متحد ہو گئے۔ اسی اتفاق و اتحاد نے تحریکِ پاکستان کو غیر معمولی قوت عطا کی اور آخر کار یہ ایک مستقل خود مختار ملک بنا۔ ورنہ ظاہر بات ہے کہ مادی منافع کے نام پر، یا اشتراکیت کے نام پر، یا پٹھانیت، بنگالیت، پنجابیت، سندھیت اور بلوچیت کے نام پر کوئی تحریک اٹھانے سے یہ معجزہ ہرگز رونما نہ ہو سکتا تھا۔

نصیحت خواہ دیوار پر لکھی ہوئی ہو اُسے قبول کر لینا چاہیے اور صحیح بات اگر دشمن بھی کہے تو اس پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیے۔ ہمارے ملک کے سیاسی حالات پر غیر ملکی اخبارات اور جرائد نے جو تبصرے کیے ہیں ان میں تعصب اور تنگ نظری اور جذبۂ عداوت کے باوجود بہت سی کام کی باتیں بھی کہی گئی ہیں۔ اگرچہ بعض باتیں بڑی تلخ ہیں مگر چند پہلوؤں سے ہمارے لیے بڑی مفید اور کارآمد بھی ہیں۔ ان سب باتوں میں

ایک نمایاں بات یہ ہے کہ پاکستانی قوم کے دل میں اُس اصل نصب العین کے ساتھ لگاؤ باقی نہیں رہا ہے جس کی خاطر اس نے یہ ملک حاصل کیا تھا۔ ان مغربی اخبار نویسوں کی نظر میں پاکستان کی موجودہ تشویشناک سیاسی صورتِ حال کی وجہ یہ ہے کہ جس نسل یا جن افراد نے اسلام کے عظیم مقصد کی خاطر چھوٹے چھوٹے مقاصد کو نظر انداز کر کے پاکستان کی جنگ لڑی تھی وہ نسل اور وہ افراد آہستہ آہستہ ناپید ہو رہے ہیں۔ کچھ لوگ تو اللہ کو پیارے ہو گئے، بعض مال و دولت کی محبت میں سرشار ہو کر اصل نصب العین بھلا بیٹھے، بعض عمر کے تقاضے یا دوسری مصلحتوں کے پیشِ نظر گوشہ نشین ہو گئے اور بعض نے عملی زندگی کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے بجائے خاموش تماشائی بن کر رہنا پسند کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ملک کی سیاسی فضا پر ایسی قوتیں نمودار ہوتی ہیں جو پاکستان کے حقیقی مقصد اور نصب العین سے پوری طرح آشنا نہیں یا اگر آشنا ہیں تو اس کے لیے ایثار اور قربانی کرنے کے لیے تیار نہیں۔ حتیٰ کہ بعض بیرونی مبصرین تو یہ بات کھلم کھلا کہنے لگے ہیں کہ پاکستان کے مختلف حصوں کے درمیان اب اسلام بنائے وحدت نہیں رہا ہے۔ ان کی یہ باتیں ہماری آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہیں۔ ہمیں سوچنا چاہیے کہ اسلام کے سوا ہمارے پاس اور کیا ہے جس کے ذریعہ سے ہم اُس ملک کو ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے بچا سکتے ہیں جو اتنی قربانیوں کے بعد حاصل کیا گیا تھا؟ کیا ہم مسلمان کے بجائے پٹھان، پنجابی، بنگالی، سندھی اور بلوچی ہو کر ایک رہ سکتے ہیں؟ کیا وہ اشتراکیت ہمیں ایک رکھ سکتی ہے جو اپنے کام کی ابتدا ہی علاقائی، لسانی اور طبقاتی تفریقیں ابھارنے سے کرتی ہے؟ کیا ہم دنیا کو یہ تماشا دکھانا چاہتے ہیں کہ اسلام کے نام پر متحد ہو کر جو ملک ہم نے بنایا تھا اسے ہم ۲۰ سال بھی خیریت سے نہ چلا سکے؟

جس طرح اس کرۂ ارض پر خلا ایک اَن ہونی بات ہے بالکل اسی طرح کسی ملک کی وحدت نصب العین کے خلا سے باقی نہیں رہ سکتی۔ یہ خلا جب بھی رونما ہونے لگے گا، اس وحدت میں شگاف پڑنے شروع ہو جائیں گے جنہیں پُر کرنے کے لیے کچھ دوسرے نصب العین آگے بڑھیں گے اور ہر ایک اپنا اپنا حصہ لے کر الگ ہو جائے گا۔ دنیا کے ہر فرد یا گروہ کو اپنے آپ کو سرگرمِ عمل رکھنے کے لیے کسی نصب العین سے گہری محبت اور وابستگی کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ اس کی حرارت سے اس کے اندر عمل کی قوت اور ایثار کا جذبہ پیدا ہو۔ جب عظیم مقاصد

نظروں سے اوجھل ہو جائیں تو پھر پست اور گھٹیا قسم کے مقاصد لوگوں کے دل میں گھر کر لیتے ہیں اور انسان ان کے حصول کی خاطر تگ و دو شروع کر دیتا ہے۔

بدقسمتی سے پاکستانی قوم اس وقت اس المیہ کی شکار ہے۔ جب تک اس قوم کے سربراہوں کو اسلام جیسے بلند و بالا مقصد سے تعلق خاطر رہا اس وقت تک رنگ، نسل، زبان اور مکان کے اختلاف کے باوجود یہ امت کثرت میں وحدت کا منظر پیش کرتی رہی اور یوں محسوس ہوا کہ پاکستان ایک وسیع گلستان ہے جس میں گلہائے رنگ رنگ نے حسن اور دلکشی پیدا کی ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ پاک و ہند کے مسلمانوں کی یہ وحدت جہاں دنیا کی دوسری قوموں کے لیے ایک عجیب و غریب بات تھی وہاں اسلام کی برتری اور صداقت کا ایک بین ثبوت بھی فراہم کر رہی تھی۔ مغربی قوم پرستی اور وطن پرستی کی خوگر قومیں اسے ایک عجیب بات سمجھتی تھیں کہ اس دور میں مادی بنیادوں کو نظر انداز کر کے محض ایک روحانی عقیدے کو قومیت کی اساس بنایا جائے اور مختلف نسلوں سے تعلق رکھنے والے اور مختلف بولیاں بولنے والے لوگوں کو مشترک مفادات پر جمع کرنے کے بجائے عقائد کی بنیاد پر مجتمع کیا جائے۔ مگر مسلمانوں نے اپنے عمل سے اس حقیقت کو درست ثابت کر دیا اور دنیا پر یہ بات واضح کر دی کہ انسان کا حقیقی جوہر چونکہ مادی نہیں بلکہ روحانی ہے، اس لیے انسانوں کے مابین عقائد کی بنیاد پر اخوت کے رشتے استوار ہو سکتے ہیں اور ہونے چاہییں۔

پاکستانی قوم کے اندر جب تک یہ احساسات زندہ رہے اس وقت تک ان کا شیرازہ بھی بندھا رہا، دوسری قوموں نے بھی انہیں ایک نئی انقلاب انگیز اخلاقی قوت سمجھتے ہوئے قدر کی نگاہ سے دیکھا اور داخلی طور پر علاقائی عصبیتوں کو بھی سر اٹھانے کا موقع نہ ملا۔ مگر پاکستان کے قیام کے بعد کچھ مدت نہ گزری تھی کہ پاکستانی قومیت کی اس اساس کی طرف سے اغماض برتا جانے لگا اور یہ اساس دن بدن کمزور ہوتی چلی گئی اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ علاقائی عصبیتوں نے سر اٹھایا اور مختلف طبقوں نے گروہی مفادات کے علمبردار بن کر جدوجہد شروع کر دی۔

اس صورتِ حال پر مسلمان قوم کے دشمنوں اور دوستوں اور خود بعض دردمند مسلمانوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ بڑا عبرتناک ہے۔ دشمنوں نے تو یہ کہا ہے کہ پاکستان کے اس موجودہ بحران نے اس بات کو ثابت کر دیا کہ محض

عقیدہ انسانوں کی شیرازہ بندی نہیں کر سکتا، وہ تو ایک وقتی جوش تھا جس نے مسلمانوں کو ایک مختصر سے عرصے کے لیے مجتمع کر دیا تھا، اب جذبات کا وہ ہیجان ختم ہوتے ہی انہیں اس امر کا احساس ہونے لگا ہے کہ مادی مفادات کی محبت ہی سے انسانوں کی شیرازہ بندی کی جا سکتی ہے۔ اس استدلال کے ساتھ وہ مسلمانوں کو مشورہ دے رہے ہیں کہ اب انہیں اس خام خیال کو ترک کر دینا چاہیے کہ عقیدہ کبھی ان کی قومیت کی بنیاد بن سکتا ہے اور اس کی تشکیل کے لیے انہیں کچھ مادی عناصر کا سہارا تلاش کرنا چاہیے جن میں سب سے اہم عنصر معاشی مفاد ہے۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر مغربی اخبارات و رسائل آج کل بڑی بے تابی کے ساتھ اس امید کا اظہار کر رہے ہیں کہ پاکستان عنقریب پارہ پارہ ہو جائے گا، لا قدر اللہ۔

بعض غیر ملکی مسلمان اہلِ قلم نے بھی اس موضوع پر اظہارِ خیال کیا ہے لو ان کی تصریحات میں بڑا کرب و اضطراب ہے۔ ان کی تحریریں پڑھنے سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس حادثے سے انہوں نے شدید اثر قبول کیا ہے، بلکہ بعض نے تو سخت رنجیدہ ہو کر یہ کہا ہے کہ انہیں تحریکِ پاکستان کو سمجھنے میں دھوکہ ہوا اور پاکستان کے مسلمانوں نے عملاً اُس دعوے کو غلط ثابت کر دیا ہے جو پاکستان کے مطالبے کے وقت اسلام کے بارے میں کیا گیا تھا۔

اس عظیم قومی سانحے کے بعد ہم سب کا فرض ہے کہ ہم ان اسباب پر ٹھنڈے دل سے غور کریں جو موجودہ اندوہناک صورتِ حال پر منتج ہوئے ہیں۔ اس مسئلہ پر آپ جس قدر بھی سوچیں گے، اسی نتیجے پر پہنچیں گے کہ اسلام، اس کے عقائد اور اس کی اقدار آج بھی اسلامی قومیت کی تشکیل میں ایک مضبوط بنیاد کا کام دے سکتی ہیں بشرطیکہ انہیں خلوصِ نیت کے ساتھ اپنانے کی کوشش کی جائے۔

حمل و نقل کے موجودہ ذرائع نے دنیا کے مختلف گوشوں کو ایک دوسرے سے بالکل قریب کر دیا ہے اور جغرافیائی حدبندیاں بڑی تیزی سے ٹوٹ رہی ہیں۔ ان حالات میں علاقائی بنیادوں پر قومیت کی تشکیل ایک خواب پریشاں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔

پاکستان کے معاملے میں تو یہ بات اور بھی مشکل ہے کیونکہ یہ ملک جغرافیائی لحاظ سے وحدت نہیں ہے۔ باقی رہا معاشی مفادات کے اشتراک سے باشندگان ملک کے درمیان اتفاق تو یہ بالکل زعم باطل ہے۔ معاشی مفادات

انسانوں کے مابین اخوت کے رشتے قائم نہیں کرتے بلکہ خود غرضی کو جنم دے کر انسانی برادری کے اندر انتشار پیدا کرتے ہیں۔ ملک کے موجودہ سیاسی حالات اس حقیقت کی زبردست شہادت فراہم کر رہے ہیں۔ جس دن سے معاشی مفادات کے بارے میں عوام کے ذہنوں میں یہ تاثر پیدا کرنے کی کوششیں شروع ہوئی ہیں کہ انہیں پاکستانی قومیت کی اساس بنانا چاہیے اسی روز سے ملک کے اندر زبردست خلفشار پیدا ہوا ہے۔ چنانچہ یہاں کے بعض طبقات اور گروہوں نے ملکی مسائل پر قومی نقطۂ نظر سے غور کرنے کے بجائے گروہی اور علاقائی مفادات کے نقطہ سے غور کرنا شروع کر دیا ہے۔ ان تلخ نتائج کے سامنے آ جانے کے بعد بھی جو فرد یا گروہ معاش کو قومیت کی بنیاد بنانا چاہتا ہے اس کے فاتر العقل ہونے میں کیا شبہ کیا جا سکتا ہے

پاکستان کے علاوہ دوسرے مسلمان ممالک کا حشر بھی ہمارے سامنے ہے جہاں خاکِ وطن اور زبان سے قومیت کا خمیر اٹھانے کی کوششیں کی گئیں۔ اس قسم کی مذموم کوششوں نے امتِ وسط کو انسانیت کے لیے سامانِ عبرت بنا دیا ہے۔ بھائی بھائی کے خلاف نفرت و حقارت کا شدید اظہار کر رہا ہے اور ایک دوسرے کا مددگار اور غمگسار بننے کے بجائے اسے مٹانے اور برباد کرنے پر تلا ہوا ہے۔ قومیت کے ان ملحدانہ نظریات نے پچاس کروڑ انسانوں پر مشتمل امت کے اتحاد کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا ہے اور نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ آج دنیا میں اُس کا کوئی وزن باقی نہیں رہا۔ انسانوں کی مختلف جمعیتوں کا تو ذکر ہی کیا، بھیڑوں کے گلوں کی بھی دنیا میں اہمیت ہے مگر انسانوں کی اس زبردست بھیڑ کی قطعاً کوئی وقعت نہیں جو مسلمان کے نام سے دنیا میں پھیلی ہوئی ہے۔ جو قوم چاہتی ہے انہیں آسانی سے اپنے استعماری عزائم کی تکمیل کا ذریعہ بنا لیتی ہے۔ دنیا میں کوئی ایک بھی خطہ ایسا نہیں جہاں یہ امت عزت و احترام کی زندگی بسر کر رہی ہو اور دنیا کی غیر مسلم قومیں اسے درخورِ اعتنا سمجھتی ہوں۔ مٹھی بھر اسرائیلیوں نے کروڑوں انسانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا ہے۔ یہ دردانگیز صورتِ حال آخر خود بخود تو پیدا نہیں ہو گئی۔ بلکہ اس کے کچھ اسباب ہیں اور ان میں سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ امتِ مسلمہ نے قوت و طاقت کے اُس اتھاہ خزانے کو ٹھکرا دیا ہے جو خالقِ کائنات نے اسے عطا فرمایا ہے۔ اس نے اس لازوال نعمت کی قدر نہیں پہچانی اور گھٹیا مقاصد کی محبت میں گرفتار ہو کر گھٹیا کاموں میں اپنی توانائیں ضائع کرنے لگی۔ آخر کار اس

غیور ذات نے اسے اس کی حماقت پر یہ سزا دی کہ اسے دنیا میں ذلیل و خوار بنا کر رکھ دیا۔

مُسلم قوم کو یہ بات ہمیشہ ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ قومی اساس کوئی ایسی چیز نہیں ہے جسے جلدی جلدی تبدیل کیا جا سکے۔ یہ اساس کسی قوم کو بڑی مشکل سے فراہم ہوتی ہے، طویل مدت تک اس کے مطابق انسانوں کی شیرازہ بندی کی جاتی ہے اور اس کا مزاج اس قوم کے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے ہوتا ہے۔ اگر مُسلم قوم کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اِس قوم کی تعمیر جس اساس پر کی گئی تھی اس کو چھوڑ کر کسی دوسری اساس پر اس کی قومیت کا محل تعمیر کرنا بالکل ناممکنات میں سے ہے۔ وہ اگر ایک قوم بن سکتی ہے تو انہی بنیادوں پر بن سکتی ہے۔ اُن سے ہٹ کر کوئی دوسری بنیاد فراہم کرنے کی کوشش کی جائے تو یہ اس پر مجتمع ہو کر اپنی قومیت تو تعمیر نہیں کر سکتی، البتہ پارہ پارہ ہو کر اپنی ہستی ضرور مٹا سکتی ہے۔

انسان کے اندر فطری طور پر یہ احساس ہمیشہ ایک لَو کی طرح فروزاں رہتا ہے کہ وہ انسانیت کی وسیع تر برادری کا ایک رُکن ہے اور اس کے اور دوسرے انسانوں کے درمیان رنگ و نسل کے اختلافات کے باوجود ایک رشتۂ اخوّت موجود ہے۔ اسلام نے انسانی رُوح کی اس فطری پیاس کے لیے تسکین کا سامان فراہم کیا اور عقیدے اور اخلاق کی بنیاد پر انسانوں کی شیرازہ بندی کی۔ اُس نے حبشہ کے رہنے والے بلالؓ، روم سے تعلق رکھنے والے صُہیبؓ اور ایران میں جنم لینے والے سلمانؓ کو رنگ، نسل اور مکان کے اختلاف کے باوجود ایک رشتۂ اخوت میں منسلک کر دیا مگر مکّہ کے سرکش اور باغی سردار کو جس کا حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے نسلی اور وطنی تعلق تھا اسلامی برادری میں لینے سے انکار کر دیا۔

پھر مدینہ میں ہجرت کے بعد نسل کی بنیاد پر نہیں بلکہ عقیدے کی بنیاد پر دنیا کی ایک نرالی اخوت قائم ہوئی۔ حضور سرورِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے مُسلم قومیت کے لیے جو مقدس اساس فراہم کی تھی اس پر پُورے تیرہ سو سال تک اسلامی قومیت کا محل تعمیر ہوتا رہا۔ اس طویل مدت میں لاتعداد نسلوں اور قوموں کے افراد کروڑوں نہیں بلکہ اربوں کی تعداد میں حلقہ بگوش اسلام ہو کر اس قومیت میں شامل ہوتے چلے گئے

اور انہوں نے رنگ، نسل اور وطن کے بتوں کو پاش پاش کر کے عملاً یہ ثابت کر دیا کہ وہ سب اپنے خالق اور مالک کے بندے اور اس کے آخری نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے تبعین ہیں اور یہ عقیدہ ہی وہ اصل چیز ہے جو انہیں دوسری قوموں اور گروہوں سے الگ کر کے ایک عالمگیر امت بناتا ہے۔

قومیت کی یہ اساس جس کے پیچھے تیرہ سو سال کی درخشاں تاریخ ہو جس کے مطابق ہزار ہا نسلیں اور قومیں اسلام کی وسیع تر برادری میں مدغم ہوتی ہوں، جس نے مسلم قوم کو نہ صرف وحدتِ فکر اور وحدتِ عمل دی ہو بلکہ اسے بے مثال قوت و طاقت بھی فراہم کی ہو، اور پھر جس کی جڑیں مسلم قوم کے جذبہ و احساس اور اس کی روایات میں پوری طرح پیوست ہوں، اس کے متعلق یہ خیال کرنا کہ چند شوریدہ سر افراد کے شور و غوغا سے اس اساس کو بدلا جا سکتا ہے اور اس کی جگہ کوئی دوسری اساس لا کر مسلمانوں کے اندر کوئی دوسری قومیت پیدا کی جا سکتی ہے، پرلے درجے کی حماقت اور کم فہمی ہے۔

پاکستان اور دوسرے تمام مسلمان ممالک کا اس وقت سب سے اہم مسئلہ یہی ہے کہ اسلامی قومیت کی اس اساس کو کس طرح سے قوت بہم پہنچائی جائے۔ کیونکہ یہ اساس جتنی زیادہ مضبوط اور طاقتور ہوگی اسی نسبت سے غیر اسلامی عصبیتیں کمزور اور مضمحل ہوں گی اور امتِ مسلمہ میں اتفاق اور اتحاد کے علاوہ فکر و عمل کی غیر معمولی قوت بھی پیدا ہوگی۔

اس وقت ان ممالک میں جو صورتِ حال موجود ہے اس سے کسی روشن مستقبل کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ مسلمانوں کے اربابِ اختیار اور ان کے سربراہ زبان سے تو وقتاً فوقتاً اسلام کے ساتھ گہری عقیدت کا اظہار کرتے ہیں مگر ان کا طرزِ عمل ان کے اس دعوے کی کھلے طور پر تردید کرتا ہے۔ ان کی اس روش کو دیکھ کر کبھی کبھی یوں احساس ہونے لگتا ہے کہ شاید اللہ کا دین ان لوگوں کے نزدیک محض ایک مشغلہ ہے یا سادہ لوح عوام کے جذبات سے کھیلنے کے لیے ایک کھوکھلا نعرہ ہے۔

ہمارے اپنے ملک میں پچھلے دنوں انتشار کے جو روح فرسا مناظر دیکھنے میں آئے وہ اسلام کے بارے میں حکمرانوں کی اسی متضاد پالیسی کے ناگزیر نتائج تھے۔ سابق صدرِ مملکت اور ان کے رفقاء کار کم و بیش ہر تقریب

میں اسلام کی عظمت کا ذکر فرماتے رہے اور یہ کہتے رہے کہ اسلام ہی انسانیت کے دکھوں کا علاج ہے مگر پاکستان کے دکھوں کے مداوا کے لیے انہیں کبھی اللہ کے اس دین کی طرف رجوع کرنے کی توفیق نصیب نہ ہوئی بلکہ تمام ملکی مسائل کو حل کرنے کے لیے مغرب کے مادہ پرستانہ اور غیر اسلامی افکار پر اعتماد کرنے کی کوشش کی گئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کی یہ اساس عقیدت و محبت کا دم بھرنے کے باوجود کمزور ہوتی گئی اور اس کی جگہ ملحدانہ نظریات نے اس خطۂ پاک میں پرورش پانا شروع کیا۔

کسی قوم کی نظریاتی اساس اس کی قوت کا سرچشمہ ہوتی ہے مگر یہ اُسی صورت میں اسے توانائی فراہم کرتی ہے جب اس سرچشمے سے قومی زندگی کے سارے گوشوں کو اچھی طرح سیراب کیا جائے۔ ہمارے ہاں اس سرچشمہ ہدایت کی تعریف و توصیف میں بیان تو دیئے جاتے رہے مگر کسی شعبے میں بھی اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی گئی۔ اسی وجہ سے ہماری قوم اس نظریاتی اساس سے دن بدن دُور ہوتی چلی جا رہی ہے۔ اگر ہم قوم کو فی الحقیقت دنیوی اعتبار سے سربلند اور آخرت میں فائز المرام دیکھنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے ہمیں سب سے پہلے اس بات کی کوشش کرنی چاہیے کہ اس ملک کے باشندوں کے دلوں میں ملت کی اس نظریاتی اساس کے بارے میں گہرا اعتماد پیدا ہو اور انہیں اس امر کا یقین ہو کہ دوسروں سے مانگے تانگے کے لائے ہوئے نصب العین اور نظام ہائے حیات اسے کبھی بھی فلاح و کامرانی سے ہمکنار نہیں کر سکتے۔ اس ضمن میں اس بات کی بھی اشد ضرورت ہے کہ مسلمانوں کو اسلام سے جو جذباتی تعلق ہے اسے مزید مستحکم کیا جائے اور اس کے ساتھ ساتھ اس تعلق کے لیے عقلی بنیادیں بھی فراہم کی جائیں کیونکہ جذبات کو اگر مسلسل غذا نہ ملے تو وہ جلد ہی ٹھنڈے ہو کر انسانوں کے اندر یاس و قنوطیت پیدا کر دیتے ہیں۔

یوں تو پاکستان کے ہر فرد کے لیے اس کا اہتمام ضروری ہے لیکن نوجوان نسلوں کے لیے تو اس کی انتہائی ضرورت ہے۔ ہمارے نوجوان ایک ایسے نظامِ تعلیم سے فکری غذا حاصل کر رہے ہیں اور ایک ایسے ماحول میں پرورش پا رہے ہیں جو اس ملک کی نظریاتی اساس اور اس امت کے اجتماعی مزاج سے کسی طرح بھی

مطابقت نہیں رکھتا۔ اس پر مزید یہ کہ ہمارے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں، حتیٰ کہ ہمارے ہائی اسکولوں تک میں ایک کثیر تعداد ایسے اُستادوں کی موجود ہے جو نوجوان نسل کو عقیدے اور اخلاق، دونوں کے اعتبار سے غیر مسلم بنانے کی مسلسل کوشش کر رہی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری نوخیز نسلوں کے قلب و دماغ میں غیر اسلامی افکار و تصورات نے راہ پائی ہے، اور ان میں سے ایک اچھی خاصی تعداد نے دانستہ یا نادانستہ طور پر باطل نظریات کا پرچار شروع کر دیا ہے۔ خدا نہ کرے کہ یہ اندوہناک صورتِ حال قائم رہے۔ لیکن بدقسمتی سے اگر اس کی اصلاح کی کوئی مؤثر صورت پیدا نہ ہوئی تو نہ صرف یہ ملک نظریاتی کشمکش کا شکار ہو کر کمزور ہوگا بلکہ باپ بیٹے اور بھائی بھائی کے درمیان شفقت و احترام کے احساسات اور محبت و مودت کے رشتے قائم ہونے کے بجائے نفرت و حقارت کے جذبات پیدا ہوں گے۔ ذرا غور فرمائیں کہ جب کسی معاشرے کی نئی نسل کے ذہن میں یہ خیال راسخ ہو جائے کہ اللہ کا نام لینے والا جاہل ہے، مذہب اور مذہبی اقدار کا احترام کرنے والا تاریک خیال، رجعت پسند اور ترقی کا دشمن ہے، اخلاقی ضابطوں کی پابندی کرنے والا احمق اور بیوقوف ہے اور دینی روایات کی تقدیس کو ماننے والا سامراج کا ایجنٹ ہے تو اس کے دل میں اپنے دین کی کیا عزت باقی رہ جائے گی، اس کی سیرت میں اخلاق کا کیا مقام باقی رہ جائے گا، اور اس کی نگاہ میں اپنے بزرگوں کی، اپنی ملت کے اکابر کی، اور نیکی و شرافت کے نمونوں کی کیا قدر باقی رہ جائے گی۔ کوئی فرد کسی دوسرے کا احترام اس بنا پر کرتا ہے کہ وہ جن قدروں کو عزت اور احترام کی نگاہ سے دیکھتا ہے انہیں بعض انسانوں میں منعکس پاتا ہے۔ اب اگر ہمارے نوجوانوں میں اسلام کے خلاف نفرت و حقارت کے جذبات موجزن ہو گئے جن کے آثار اب صاف دکھائی دے رہے ہیں تو کسی دینی احساس یا کسی نیکی اور شرافت کی کیا وقعت رہ جائے گی۔ یہ نوجوان تو ان رُوحانی اور اخلاقی اقدار کے علمبرداروں کی تکریم کے بجائے انہیں قومی مفادات کا سب سے بڑا دشمن سمجھ کر بے آبرو کرنے کی فکر کریں گے، اور چاہے وہ لوگ سامراج کے ایجنٹ ہوں یا نہ ہوں جنہیں یہ گالی دی جاتی ہے، مگر یہ لوگ خود ایک ایسے بدترین سامراج کے ایجنٹ بن کر رہ جائیں گے جو پاکستان کی جڑیں تک کھود پھینکنا چاہتا ہے۔

نوجوان نسل کا یہ طرزِ عمل صرف موجودہ دَور کے نیک اور پاکباز لوگوں کے خلاف ہی نہ ہوگا بلکہ ماضی کی

وہ تمام واجب الاحترام شخصیتیں بھی جنہیں امتِ مسلمہ صدیوں سے انسانیت کا بلند ترین نمونہ مانتی چلی آرہی ہے اور جن کے تقویٰ، پرہیزگاری اور تفقہ فی الدین کو اپنے لیے اسوۂ حسنہ سمجھتی رہی ہے، انہیں بھی رجعت پسند اور اپنے اپنے دور کے سرمایہ داروں کا آلۂ کار کہہ کر رسوا کیا جائے گا اور جن مقدس ہستیوں کو مسلمان آج تک روشنی کے مینار سمجھتے رہے ہیں انہیں تاریکی اور ظلمت کے ساتھی ثابت کرنے کی کوششیں کی جائیں گی۔ یوں اس قوم کی نئی نسل کو ماضی سے بغاوت پر اُبھارا جائے گا اور اس کا رشتہ اس کی بہترین روایات سے کاٹ ڈالا جائے گا۔

ہمارے یہ تاثرات کوئی موہوم خدشات نہیں ہیں۔ جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے تھوڑی سی بصیرت دی ہے وہ حالات کے تیور دیکھ کر ان کا بخوبی اندازہ کر سکتا ہے۔ نوجوان نسل کے اندر شدید ہیجان اور اضطراب پایا جاتا ہے اور یہ اضطراب کوئی تعمیری رُخ اختیار کرنے کے بجائے تخریب کی صورت میں نمودار ہو رہا ہے۔ خدا خوفی، ضبطِ نفس، آخرت کی جواب دہی کا احساس، اخلاقی حدود کی پابندی، الغرض اللہ کے دین نے نیکی کی راہ پر چلانے کے لیے ہم کو جتنے بنیادی اوصاف بھی دیئے ہیں، آج ان سب کو معاذاللہ ذہنی عوارض سے تعبیر کیا جا رہا ہے، ان کا مذاق اُڑایا جا رہا ہے اور جو لوگ ان کی تبلیغ کرتے ہیں انہیں ہر طرح کی پھبتیوں اور الزامات اور طنز و تضحیک سے رُسوا کیا جا رہا ہے۔ دین کے خلاف اسی باغیانہ پروگرام کا ایک حصّہ یہ بھی ہے کہ ماضی کی ان شخصیتوں کو اُبھارا جا رہا ہے جن کی روش عقیدے اور عمل کے اعتبار سے اُمّت کی عام روش سے مختلف رہی ہے، اور خاص طور پر ان کے اُن افکار کو تو بہت اُچھالنے کی کوشش کی جاتی ہے جن کی مدد سے جدید جاہلیت کے لیے تائید اور حمایت حاصل کی جا سکے۔ اُمت نے جن مفکرین کو ہمیشہ گمراہ سمجھا ہے اور جن کے خیالات سے ہمیشہ برأت کا اظہار کیا ہے انہیں ہماری علمی اور فکری تحریک کے ہراول دستے کے طور پر پیش کیا جاتا ہے اور ان کے مقابلے میں ان ہستیوں پر سوقیانہ انداز میں تنقید کی جاتی ہے جو اُمت کے ہر طبقے میں ہمیشہ بے حد احترام کی نظر سے دیکھی گئیں اور جن کی بصیرت، دینی فہم اور خدا ترسی پر قوم نے ہمیشہ بھروسا اور اعتماد کیا۔

سطح بیں آنکھیں اس قسم کے فکری رجحانات کو محض ایک وقتی اضطراب سمجھ کر نظر انداز کرسکتی ہیں لیکن جو لوگ بغاوت کے پیچھے کام کرنے والے عناصر اور ان کے فکر و عمل کے محرکات کو جانتے ہیں انہیں اس بات کا بخوبی علم ہے کہ ان گمراہ کُن نظریات کا پرچار کیوں اور کن ناپاک مقاصد کے تحت کیا جا رہا ہے۔ یہ لوگ اپنے باطل تصوّرات کو پھیلانے وقت کبھی کبھی ابن خلدون، امام غزالیؒ، محی الدین، ابن عربیؒ، شاہ ولی اللہؒ اور ڈاکٹر اقبال مرحوم کے خیالات کو موڑ توڑ کر اپنے موقف کی تائید میں پیش کرتے ہیں بلکہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ تک کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر ڈالتے ہیں۔ لیکن اُن کی اس مذموم کاوش کی غرض بجز اس کے اور کچھ نہیں ہوتی کہ ان بزرگوں کے سہارے اپنے باطل اوہام کو امت کے اندر رواج دینے کا موقع فراہم کریں۔ حالانکہ وہ خود بھی جانتے ہیں اور پوری امت بھی اس حقیقت سے واقف ہے کہ ان میں سے کوئی ایک بزرگ بھی ایسا نہیں ہوا ہے جسے ان مادہ پرستانہ فلسفوں اور نظریات سے دُور کا بھی کوئی واسطہ ہو جن کی مدد کے لیے ان کے نام استعمال کیے جاتے ہیں۔ آخر ان میں سے کس کا نقطۂ نظر یہ رہا ہے کہ انسانی فکر و عمل کے محرکات روحانی نہیں بلکہ مادی ہیں؟ کون اس بات کا قائل رہا ہے کہ دنیا کا ہر اخلاقی اور دینی نظام وقت کے معاشی حالات کی پیداوار ہوتا ہے؟ کس کا عقیدہ یہ رہا ہے کہ ہمیں کسی ایسے نظام اخلاق اور نظریۂ حیات کی ضرورت نہیں جس کا مبدأ وحی و الہام ہو یا جس کی پشت پر کسی آخرت کی جوابدہی کا اعتقاد کارفرما ہو؟ کس کے حاشیۂ خیال میں بھی کبھی یہ بات آئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عہد مبارک میں جو کچھ بھی کیا اور فرمایا ہے وہ اُسی خاص دَور کے لیے تھا اور اب ہمارے دَور میں ان تعلیمات کی قطعاً کوئی اہمیت باقی نہیں رہی ہے؟ پھر یہ فریب اور علمی بددیانتی نہیں تو اور کیا ہے کہ جو نظریات اور فلسفے منکرین و مخالفین اسلام سے اخذ کر کے لائے جاتے ہیں اور جن کی بنیاد سراسر مادہ پرستی اور انکارِ وحی و نبوت و آخرت پر ہے ان کے حق میں کبھی حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کو لا کھڑا کیا جاتا ہے اور کبھی شاہ ولی اللہ کو اور کبھی علامہ اقبالؒ کو؟ اس کا مقصد آخر اس کے سوا کیا ہے کہ مسلمان عوام کو دھوکا دیا جائے اور انہیں کسی طرح یہ باور کرایا جائے کہ اس امت میں اوّل تو اہل علم اور اہلِ فکر کا ہمیشہ قحط رہا ہے اور لے دے کر جو چند ہستیاں نظر آتی ہیں وہ اِن کے افکار کی مؤید اور حامی ہیں۔ اس کے بعد جب ان

چند نامور شخصیتوں کے ہاں بھی اس نوعیت کا کوئی منظم فلسفہ نہیں ملتا جس کے طلسم میں ہمارے نوجوان آجکل گرفتار ہو رہے ہیں تو اُن کی حیثیت بھی ان فریب خوردہ نوجوانوں کی نظر میں تیسرے یا چوتھے درجے کے اہلِ فکر کی رہ جاتی ہے اور ان کے دل و دماغ پر اصل اہمیت اُن فلاسفہ اور مصنفین کی ثبت ہو جاتی ہے جنہوں نے مذہب اور مذہبی اقدار سے علانیہ بغاوت کر کے مادہ پرستانہ فکر کو ایک باقاعدہ نظام کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔

اگر ہم فی الحقیقت موجودہ نسل کے اس طرزِ فکر اور طرزِ عمل کو تشویش کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں اور اس بات کے سچے دل سے آرزومند ہیں کہ ہمارے نوجوانوں کے دلوں میں اپنی تابناک روایات سے عقیدت و محبت پیدا ہو اور ان کا دینی اقدار پر پھر سے یقین بحال ہو تو اس کے لیے ضروری ہے کہ رائج الوقت نظامِ تعلیم میں بنیادی تبدیلیاں کی جائیں۔ اوّلین تبدیلی جو ضروری ہے وہ یہ ہے کہ پورے نصاب کو از سرِ نو اس انداز سے مرتب کیا جائے کہ اسلامی تعلیمات کے بارے میں تشکک پیدا ہونے کے بجائے یقین پیدا ہو اور نوجوان جب سکولوں اور کالجوں سے فارغ ہو کر نکلیں تو وہ ایمان کی دولت سے محروم ہو کر نکلنے کے بجائے اس نعمت سے مالا مال ہو کر عملی زندگی میں قدم رکھیں۔ ادب ان کے اندر اخلاقی اقدار سے انحراف پیدا کرنے کے بجائے انہیں تہذیبِ نفس کی طرف مائل کرے۔ فلسفہ ان کے روحانی احساسات بیدار کرے۔ معیشت ان کے اندر اقتصادی مسائل اور کاروباری معاملات میں اخلاقی ذمہ داریوں کا شعور پیدا کرے۔ سیاست انہیں زندگی کے اجتماعی معاملات کو نیکی، خداترسی اور احساسِ ذمہ داری کے ساتھ حل کرنے کی تعلیم دے اور سائنس انہیں خالقِ کائنات کا باغی نہ بنائے بلکہ انہیں مومنِ صادق بنا کر ان کے قلب و دماغ پر قادرِ مطلق کی عظمت کا نقش ثبت کرے۔

دوسری اہم تبدیلی یہ درکار ہے کہ ہماری درس گاہوں کو نیچے سے اوپر تک ایسے اُستادوں کے وجود سے پاک کر دیا جائے جو ہماری نوجوان نسل کو اسلام سے منحرف کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اگر روس اور چین کی درس گاہوں میں کسی ایسے استاد کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے جو مارکس اور لینن کے نظریات سے بغاوت کی تعلیم دیتا ہے تو پاکستان کی درس گاہوں میں ایسے اُستادوں کے لیے کوئی جگہ کیوں ہو جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم

تفہیم القرآن

التغابن

نام | آیت نمبر ۹ کے فقرے ذَالِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ سے ماخوذ ہے ۔ یعنی وہ سورۃ جس میں لفظ تغابن آیا ہے ۔

زمانۂ نزول | مقاتل اور کلبی کہتے ہیں کہ اس کا کچھ حصہ مکی ہے اور کچھ مدنی ۔ حضرت عبداللہ بن عباس اور عطاء بن یسار کہتے ہیں کہ ابتدا سے آیت ۱۳ تک مکی ہے اور آیت ۱۴ سے آخر سورۃ تک مدنی ۔ مگر مفسرین کی اکثریت پوری سورۃ کو مدنی قرار دیتی ہے ۔ اگرچہ اس میں کوئی اشارہ ایسا نہیں پایا جاتا جس سے اس کا زمانۂ نزول متعین کیا جاسکتا ہو لیکن مضمونِ کلام پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالباً یہ مدینۂ طیبہ کے ابتدائی دور میں نازل ہوئی ہوگی ۔ اسی وجہ سے اس میں کچھ رنگ مکی سورتوں کا سا اور کچھ مدنی سورتوں کا سا پایا جاتا ہے ۔

موضوع اور مضمون | اس سورہ کا موضوع ایمان وطاعت کی دعوت اور اخلاقِ حسنہ کی تعلیم ہے ۔ کلام کی ترتیب یہ ہے کہ پہلی چار آیتوں کا خطاب تمام انسانوں سے ہے ، پھر آیت ۵ سے ۱۰ تک ان لوگوں سے خطاب کیا گیا ہے جو قرآن کی دعوت کو نہیں مانتے ، اور اس کے بعد نمبر ۱۱ سے آخر تک کی آیات کا روئے سخن اُن لوگوں کی طرف ہے جو اس دعوت کو مانتے ہیں ۔

تمام انسانوں کو خطاب کر کے چند مختصر فقروں میں انہیں چار بنیادی حقیقتوں سے آگاہ کیا گیا ہے :

اوّل یہ کہ یہ کائنات ، جس میں تم رہتے ہو ، بے خدا نہیں ہے بلکہ اس کا خالق اور مالک اور فرمانروا ایک ایسا قادرِ مطلق خدا ہے جس کے کامل اور بے عیب ہونے کی شہادت اِس کائنات کی

ہر چیز دے رہی ہے۔

دوسرے یہ کہ یہ کائنات بے مقصد اور بے حکمت نہیں ہے بلکہ اس کے خالق نے اسے برسر برحق پیدا کیا ہے۔ یہاں اس غلط فہمی میں نہ رہو کہ یہ ایک فضول تماشا ہے جو عبث ہی شروع ہوا اور عبث ہی ختم ہو جائے گا۔

تیسرے یہ کہ تمھیں جس بہترین صورت کے ساتھ خدا نے پیدا کیا ہے اور پھر جس طرح کفر و ایمان کا اختیار تم پر چھوڑ دیا ہے، یہ کوئی لاحاصل اور لایعنی کام نہیں ہے کہ تم خواہ کفر اختیار کرو یا ایمان، دونوں صورتوں میں اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو۔ دراصل خدا یہ دیکھ رہا ہے کہ تم اپنے اس اختیار کو کس طرح استعمال کرتے ہو۔

چوتھے یہ کہ تم غیر ذمہ دار اور غیر جواب دہ نہیں ہو۔ آخرکار تمھیں اپنے خالق کی طرف پلٹ کر جانا ہے اور اُس ہستی سے تمھیں سابقہ پیش آنا ہے جو کائنات کی ہر چیز سے واقف ہے، جس سے تمھاری کوئی بات پوشیدہ نہیں، جس پر دلوں کے چھپے ہوئے خیالات تک روشن ہیں۔

کائنات اور انسان کی حقیقت کے بارے میں یہ چار بنیادی باتیں بیان کرنے کے بعد کلام کا رُخ اُن لوگوں کی طرف مڑتا ہے جنھوں نے کُفر کی راہ اختیار کی ہے، اور اُنھیں تاریخ کے اس منظر کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے جو پوری انسانی تاریخ میں مسلسل نظر آتا ہے کہ قوموں پر قومیں اٹھتی ہیں اور بالآخر تباہی سے دوچار ہوتی ہیں۔ انسان اپنی عقل سے اس منظر کی ہزار توجیہیں کرتا رہا ہے، مگر اللہ تعالیٰ اصل حقیقت بتاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ قوموں کی تباہی کے بنیادی اسباب صرف دو تھے:

ایک یہ کہ اُس نے جن رسولوں کو ان کی ہدایت کے لیے بھیجا تھا، اُن کی بات ماننے سے انھوں نے انکار کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ نے بھی انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیا اور وہ خود ہی اپنے فلسفے گھڑ گھڑ کر ایک گمراہی سے دوسری گمراہی میں بھٹکتی چلی گئیں۔

دوسرے یہ کہ انھوں نے آخرت کے عقیدے کو بھی رد کر دیا اور اپنے زعم میں یہ سمجھ لیا کہ

جو کچھ ہے بس یہی دنیا کی زندگی ہے، اِس کے بعد کوئی اور زندگی نہیں ہے جس میں ہمیں اپنے خدا کے سامنے اپنے اعمال کا جواب دینا ہو۔ اِس چیز نے ان کے پورے رویّہ زندگی کو بگاڑ کر رکھ دیا اور ان کے اخلاق و کردار کی گندگی اس حد تک بڑھتی چلی گئی کہ آخر کار خدا کے عذاب ہی نے آکر دنیا کو ان کے وجود سے پاک کیا۔

تاریخِ انسانی کے یہ دو سبق آموز حقائق بیان کر کے منکرینِ حق کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ ہوش میں آئیں اور اگر پچھلی قوموں کا سا انجام نہیں دیکھنا چاہتے تو اللہ اور اس کے رسُول اور اُس نُورِ ہدایت پر ایمان لے آئیں جو اللہ نے قرآن مجید کی صورت میں نازل فرمایا ہے۔ اِس کے ساتھ اُن کو خبردار کیا جاتا ہے کہ آخر کار وہ دن آنے والا ہے جب تمام اوّلین و آخرین ایک جگہ جمع کیے جائیں گے اور تم میں سے ہر ایک کا غبن سب کے سامنے کُھل جائے گا۔ پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تمام انسانوں کی قسمت کا فیصلہ اِسی بنیاد پر کیا جائے گا کہ ایمان و عملِ صالح کی راہ کس نے اختیار کی تھی، اور کفر و تکذیب کی راہ پر کون چلا تھا۔ پہلا گروہ ابدی جنت کا حق دار ہوگا اور دوسرے گروہ کے حصے میں دائمی جہنّم آئے گی۔

اِس کے بعد ایمان کی راہ اختیار کرنے والوں کو مخاطب کر کے چند اہم ہدایات اُنہیں دی جاتی ہیں:

ایک یہ کہ دنیا میں جو مصیبت بھی آتی ہے، اللہ کے اذن سے آتی ہے۔ ایسے حالات میں جو شخص ایمان پر ثابت قدم رہے، اللہ اس کے دل کو ہدایت بخشتا ہے، ورنہ گھبراہٹ یا جھنجلاہٹ میں مبتلا ہو کر جو آدمی ایمان کی راہ سے ہٹ جائے، اس کی مصیبت تو اللہ کے اذن کے بغیر دُور نہیں ہو سکتی، البتہ وہ ایک اور مصیبت، جو سب سے بڑی مصیبت ہے، مُول لے لیتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اس کا دل اللہ کی ہدایت سے محروم ہو جاتا ہے۔

دوسرے یہ کہ مومن کا کام صرف ایمان لے آنا ہی نہیں ہے بلکہ ایمان لانے کے بعد اسے عملاً اللہ اور اس کے رسُول کی اطاعت کرنی چاہیے اطاعت سے اگر وہ رُوگردانی اختیار

کرے گا تو اپنے نقصان کا وہ خود ذمّہ دار ہوگا۔ کیونکہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم حق پہنچا کر بری الذمہ ہو چکے ہیں۔

تیسرے یہ کہ مومن کا اعتماد اپنی طاقت یا دنیا کی کسی طاقت پر نہیں بلکہ صرف اللہ پر ہونا چاہیے۔

چوتھے یہ کہ مومن کے لیے اُس کا مال اور اُس کے اہل وعیال ایک بہت بڑی آزمائش ہیں کیونکہ زیادہ تر انہی کی محبت انسان کو ایمان وطاعت کی راہ سے منحرف کرتی ہے۔ اس لیے اہلِ ایمان کو اپنے اہل وعیال سے ہوشیار رہنا چاہیے کہ وہ بالواسطہ یا بلاواسطہ اُن کے حق میں راہِ خدا کے رہزن نہ بننے پائیں، اور انہیں اپنا مال خدا کی راہ میں خرچ کرنا چاہیے تاکہ اُن کا نفس زر پرستی کے فتنوں سے محفوظ رہے۔

پانچویں یہ کہ ہر انسان اپنی استطاعت کی حد تک ہی مکلف ہے۔ اللہ تعالیٰ کا مطالبہ یہ نہیں ہے کہ آدمی اپنی استطاعت سے بڑھ کر کام کرے۔ البتہ مومن کو جس بات کی کوشش کرنی چاہیے وہ یہ ہے کہ اپنی حد تک خدا سے ڈرتے ہوئے زندگی بسر کرنے میں وہ کوئی کسر اٹھا نہ رکھے اور اس کی گفتار، کردار اور معاملات اس کی اپنی کوتاہی کے باعث حدُود اللہ سے متجاوز نہ ہو جائیں۔

اللہ کے نام سے جو رحمٰن اور رحیم ہے

اللہ کی تسبیح کر رہی ہے ہر وہ چیز جو آسمانوں میں ہے اور ہر وہ چیز جو زمین میں ہے[۱]۔ اسی کی بادشاہی ہے[۲] اور اسی کے لیے تعریف ہے[۳] اور وہ ہر چیز پر قادر ہے[۴]۔ وہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا، پھر

۱؎ تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، تفسیر سورۃ الحدید، حاشیہ ۱۔ بعد کے مضمون پر غور کرنے سے یہ بات خود سمجھ میں آجاتی ہے کہ کلام کا آغاز اس فقرے سے کیوں کیا گیا ہے۔ آگے کائنات اور انسان کی جو حقیقت بیان کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ ہی اس کا خالق، مالک، اور فرمانروا ہے۔ اور اس نے یہ کائنات بے مقصد اور بے حکمت نہیں بنائی ہے۔ اور انسان یہاں غیر ذمہ دار بنا کر نہیں چھوڑ دیا گیا ہے کہ جو کچھ چاہے کرتا پھرے، کوئی اس سے باز پرس کرنے والا نہ ہو۔ اور اس کائنات کا فرمانروا کوئی شہِ بے خبر نہیں ہے کہ اس کی سلطنت میں جو کچھ ہو رہا ہو اُس کا کوئی علم اسے نہ ہو۔ اِس مضمون کی بہترین تمہید وہی ہو سکتی تھی جو اِس مختصر سے فقرے میں ارشاد ہوئی ہے۔ موقع و محل کے لحاظ سے اِس تمہید کا مطلب یہ ہے کہ زمین سے لے کر آسمانوں کی انتہائی وسعتوں تک جدھر بھی تم نگاہ ڈالو گے، اگر تم عقل کے اندھے نہیں ہو تو تمہیں صاف محسوس ہوگا کہ ایک ذرّے سے لے کر عظیم ترین کہکشانوں تک ہر چیز نہ صرف خدا کے وجود پر گواہ ہے بلکہ اس بات کی گواہی بھی دے رہی ہے کہ اُس کا خدا ہر عیب اور نقص اور کمزوری اور غلطی سے پاک ہے۔ اُس کی ذات و صفات، اور اس کے افعال و احکام میں کسی عیب و خطا، یا کسی کمزوری اور نقص کا ادنیٰ سے ادنیٰ درجے میں بھی کوئی احتمال ہوتا تو یہ کمال درجہ حکیمانہ نظام وجود ہی میں نہ آسکتا تھا، کجا کہ ازل سے ابد تک ایسے اٹل طریقے سے چل سکتا۔

۲؎ یعنی یہ پُوری کائنات تنہا اُسی کی سلطنت ہے۔ وہ صرف اس کو بنا کر اور ایک دفعہ حرکت دے کر نہیں رہ گیا ہے بلکہ وہی عملاً اس پر ہر آن حکومت کر رہا ہے۔ اِس حکومت و فرمانروائی میں کسی دوسرے کا قطعاً کوئی دخل یا حصہ نہیں ہے۔ دوسروں کو اگر عارضی طور پر اور محدود پیمانے پر اس کائنات میں کسی جگہ تصرف یا حکمرانی کے اختیارات حاصل ہیں تو وہ اُن کے ذاتی اختیارات نہیں ہیں جو انہیں اپنے زور پر حاصل ہوئے ہوں، بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے ہیں، جب تک اللہ چاہے وہ انہیں حاصل رہتے ہیں، اور جب چاہے وہ انہیں سلب کر سکتا ہے۔

۳؎ بالفاظِ دیگر وہی اکیلا تعریف کا مستحق ہے، دوسری جس ہستی میں بھی کوئی قابلِ تعریف خوبی پائی جاتی ہے وہ اسی کی عطا کی ہوئی ہے۔ اور اگر حمد کو شکر کے معنی میں لیا جائے تو شکر کا بھی اصل مستحق وہی ہے، کیونکہ ساری نعمتیں

تم میں سے کوئی کافر ہے اور کوئی مومن[۵]، اور اللہ وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے جو تم کرتے ہو[۶]۔ اس نے زمین

اسی کی پیدا کی ہوئی ہیں اور ساری مخلوقات کا حقیقی محسن اُس کے سوا کوئی نہیں ہے۔ دوسری کسی ہستی کے کسی احسان کا ہم شکریہ ادا کرتے ہیں تو اس بنا پر کرتے ہیں کہ اللہ نے اپنی نعمت اُس کے ہاتھوں ہم تک پہنچائی، ورنہ وہ خود نہ اس نعمت کا خالق ہے، نہ اللہ کی توفیق کے بغیر وہ اس نعمت کو ہم تک پہنچا سکتا تھا۔

[۴] یعنی وہ قادر مطلق ہے۔ جو کچھ کرنا چاہے کر سکتا ہے۔ کوئی طاقت اس کی قدرت کو محدود کرنے والی نہیں ہے۔

[۵] اس کے چار مفہوم ہیں اور چاروں اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں:

ایک یہ کہ وہی تمہارا خالق ہے، پھر تم میں سے کوئی اس کے خالق ہونے کا انکار کرتا ہے اور کوئی اس حقیقت کو مانتا ہے۔ یہ مفہوم پہلے اور دوسرے فقرے کو ملا کر پڑھنے سے متبادر ہوتا ہے۔

دوسرے یہ کہ اسی نے تم کو اس طرح پیدا کیا ہے کہ تم کفر اختیار کرنا چاہو تو کر سکتے ہو، اور ایمان لانا چاہو تو لا سکتے ہو۔ ایمان و کفر میں سے کسی کے اختیار کرنے پر بھی اس نے تمہیں مجبور نہیں کیا ہے۔ اس لیے اپنے ایمان و کفر، دونوں کے تم خود ذمہ دار ہو۔ اس مفہوم کی تائید بعد کا یہ فقرہ کرتا ہے کہ "اللہ وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے جو تم کرتے ہو"۔ یعنی اس نے یہ اختیار دے کر تمہیں امتحان میں ڈالا ہے اور وہ دیکھ رہا ہے کہ تم اپنے اس اختیار کو کس طرح استعمال کرتے ہو۔

تیسرا مفہوم یہ ہے کہ اس نے تو تم کو فطرتِ سلیمہ پر پیدا کیا تھا جس کا تقاضا یہ تھا کہ تم سب ایمان کی راہ اختیار کرتے، مگر اس صحیح فطرت پر پیدا ہونے کے بعد تم میں سے بعض لوگوں نے کفر اختیار کیا جو اُن کی خلقت و آفرینش کے خلاف تھا، اور بعض نے ایمان کی راہ اختیار کی جو ان کی فطرت کے مطابق تھی۔ یہ مضمون اس آیت کو سورۂ روم کی آیت ۳۰ کے ساتھ ملا کر پڑھنے سے سمجھ میں آتا ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ "یک سُو ہو کر اپنا رُخ اِس دین پر جما دو، قائم ہو جاؤ اُس فطرت پر جس پر اللہ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے، اللہ کی بنائی ہوئی ساخت نہ بدلی جائے، یہی بالکل راست اور درست دین ہے۔" اور اسی مضمون پر وہ متعدد احادیث روشنی ڈالتی ہیں جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار یہ فرمایا ہے کہ ہر انسان صحیح فطرت پر پیدا ہوتا ہے اور بعد میں خارج سے کفر و شرک اور گمراہی اُس پر عارض ہوتی ہے (تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد سوم، تفسیر سورۂ روم حاشیہ ۴۲ تا ۴۷)۔ اس مقام پر یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ کتبِ آسمانی نے کبھی انسان کے

اور آسمانوں کو برحق پیدا کیا ہے، اور تمہاری صورت بنائی اور بڑی عمدہ بنائی ہے، اور اسی کی طرف آخرکار تمہیں پلٹنا ہے۔[۵]

پیدائشی گنہگار ہونے کا وہ تصور پیش نہیں کیا ہے جسے ڈیڑھ ہزار سال سے عیسائیت نے اپنا بنیادی عقیدہ بنا رکھا ہے۔ آج خود کیتھولک علماء یہ کہنے لگے ہیں کہ بائیبل میں اس عقیدے کی کوئی بنیاد موجود نہیں ہے۔ چنانچہ بائیبل کا ایک مشہور جرمن عالم ریورینڈ ہربرٹ ہاگ (HAAG) اپنی تازہ کتاب (IS ORIGINAL SIN IN SCRIPTURE ?) میں لکھتا ہے کہ ابتدائی دور کے عیسائیوں میں کم از کم تیسری صدی تک یہ عقیدہ سرے سے موجود ہی نہ تھا۔ اور جب یہ خیال لوگوں میں پھیلنے لگا تو دو صدیوں تک عیسائی اہلِ علم اس کی تردید کرتے رہے۔ مگر آخر کار پانچویں صدی میں سینٹ آگسٹائن نے اپنی منطق کے زور سے اس بات کو مسیحیت کے بنیادی عقائد میں شامل کر دیا کہ "نوعِ انسانی نے آدم کے گناہ کا وبال وراثت میں پایا ہے اور مسیح کے کفارے کی بدولت نجات پانے کے سوا انسان کے لیے کوئی راہ نجات نہیں ہے۔"

چوتھا مفہوم یہ ہے کہ اللہ ہی تم کو عدم سے وجود میں لایا۔ تم نہ تھے اور پھر ہو گئے۔ یہ ایک ایسا معاملہ تھا کہ اگر تم اس پر سیدھے اور صاف طریقے سے غور و فکر کرتے اور یہ دیکھتے کہ وجود ہی وہ اصل نعمت ہے جس کی بدولت تم دنیا کی باقی دوسری نعمتوں سے متمتع ہو رہے ہو، تو تم میں سے کوئی شخص بھی اپنے خالق کے مقابلہ میں کفر و بغاوت کا رویہ اختیار نہ کرتا۔ لیکن تم میں سے بعض نے سوچا ہی نہیں، یا غلط طریقے سے سوچا اور کفر کی راہ اختیار کر لی، اور بعض نے ایمان کا وہی راستہ اختیار کیا جو فکرِ صحیح کا تقاضا تھا۔

[۴] اس فقرے میں "دیکھنے" کا مطلب محض دیکھنا ہی نہیں ہے بلکہ اس سے خود بخود یہ مفہوم نکلتا ہے کہ جیسے تمہارے اعمال ہیں ان کے مطابق تم کو جزا یا سزا دی جائے گی۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی حاکم اگر کسی شخص کو اپنی ملازمت میں لے کر یہ کہے کہ "میں دیکھتا ہوں تم کس طرح کام کرتے ہو" تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ٹھیک طرح کام کرو گے تو تمہیں انعام اور ترقی سے نوازوں گا، ورنہ تم سے سخت مواخذہ کروں گا۔

[۵] اس آیت میں تین باتیں علی الترتیب بیان کی گئی ہیں جن کے درمیان ایک بہت گہرا منطقی ربط ہے۔

پہلی بات یہ فرمائی گئی کہ اللہ نے یہ کائنات برحق پیدا کی ہے۔ "برحق" کا لفظ جب خبر کے لیے بولا جاتا ہے تو مراد ہوتی ہے سچی خبر۔ حکم کے لیے بولا جاتا ہے تو مطلب ہوتا ہے مبنی بر عدل و انصاف حکم۔ قول کے لیے بولا جاتا ہے تو مقصود ہوتا ہے راست اور درست قول۔ اور جب کسی فعل کے لیے یہ لفظ استعمال ہوتا ہے تو مراد ایسا فعل ہوتا ہے

جو حکیمانہ اور معقول ہو نہ کہ لایعنی اور فضول۔ اب یہ ظاہر ہے کہ خلق ایک فعل ہے، اس لیے تخلیقِ کائنات کو برحق کہنے کا مطلب لامحالہ یہ ہے کہ یہ کائنات کچھ کھیل کے طور پر نہیں بنا دی گئی ہے بلکہ یہ ایک خالقِ حکیم کا نہایت سنجیدہ کام ہے۔ اس کی ہر چیز اپنے پیچھے ایک معقول مقصد رکھتی ہے، اور یہ مقصدیت اس میں اتنی نمایاں ہے کہ اگر کوئی صاحبِ عقل انسان کسی چیز کی نوعیت کو اچھی طرح سمجھ لے تو یہ جان لینا اس کے لیے مشکل نہیں ہوتا کہ ایسی ایک چیز کے پیدا کرنے کا معقول اور مبنی بر حکمت مقصد کیا ہو سکتا ہے۔ دنیا میں انسان کی ساری سائنٹفک ترقی اس بات کی شہادت دے رہی ہے کہ جس چیز کی نوعیت کو بھی انسان نے غور و فکر اور تحقیق و تجسس سے سمجھ لیا اس کے بارے میں یہ بات بھی اسے آخر کار معلوم ہو گئی کہ وہ کس مقصد کے لیے بنائی گئی ہے، اور اُس مقصد کو سمجھ کر ہی انسان نے وہ بے شمار چیزیں ایجاد کر لیں جو آج انسانی تمدن میں استعمال ہو رہی ہیں۔ یہ بات ہرگز ممکن نہ ہوتی اگر یہ کائنات کسی کھلنڈرے کا کھلونا ہوتی جس میں کوئی حکمت اور مقصدیت کارفرما نہ ہوتی۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد اول، سورۂ انعام، حاشیہ ۴۶۔ جلد دوم، یونس، حاشیہ ۱۱۔ ابراہیم، حاشیہ ۲۶۔ النحل، حاشیہ ۶۔ جلد سوم، الانبیاء، حاشیہ ۱۵-۱۶۔ المومنون، حاشیہ ۱۰۲۔ العنکبوت، حاشیہ ۷۵۔ الروم، حاشیہ ۶۔ جلد چہارم، الدخان، حاشیہ ۳۴۔ الجاثیہ، حاشیہ ۲۸)۔

دوسری بات یہ فرمائی گئی کہ اس کائنات میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہترین صورت پر پیدا کیا ہے۔ صورت سے مراد محض انسان کا چہرہ نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد اُس کی پوری جسمانی ساخت ہے اور وہ قوتیں اور صلاحیتیں بھی اس کے مفہوم میں شامل ہیں جو اس دنیا میں کام کرنے کے لیے آدمی کو عطا کی گئی ہیں۔ ان دونوں حیثیتوں سے انسان کو زمین کی مخلوقات میں سب سے بہتر بنایا گیا ہے، اور اسی بنا پر وہ اس قابل ہوا ہے کہ اُن تمام موجوداتِ پر حکمرانی کرے جو زمین اور اس کے گرد و پیش پائی جاتی ہیں۔ اُس کو کھڑا قد دیا گیا ہے۔ اس کو چلنے کے لیے مناسب ترین پاؤں دیئے گئے ہیں۔ اس کو کام کرنے کے لیے موزوں ترین ہاتھ دیئے گئے ہیں اس کو ایسے حواس اور ایسے آلاتِ علم دیئے گئے ہیں جن کے ذریعہ سے وہ ہر طرح کی معلومات حاصل کرتا ہے۔ اس کو سوچنے اور سمجھنے اور معلومات کو جمع کر کے اُن سے نتائج اخذ کرنے کے لیے ایک اعلیٰ درجہ کا ذہن دیا گیا ہے۔ اس کو ایک اخلاقی حس اور قوتِ تمیز دی گئی ہے جس کی بنا پر وہ بھلائی اور بُرائی اور صحیح اور غلط میں فرق کرتا ہے۔ اُس کو ایک قوتِ فیصلہ دی گئی ہے

جس سے کام لے کر وہ اپنی راہِ عمل کا خود انتخاب کرتا ہے اور یہ طے کرتا ہے کہ اپنی کوششوں کو کس راستے پر لگائے اور کس پر نہ لگائے۔ اس کو یہاں تک آزادی دے دی گئی ہے کہ چاہے تو اپنے خالق کو مانے اور اس کی بندگی کرے ورنہ اس کا انکار کر دے، یا جن جن کو چاہے اپنا خدا بنا بیٹھے، یا جسے خدا مانتا ہو اس کے خلاف بھی بغاوت کرنا چاہے تو کر گزرے۔ اِن ساری قوتوں اور اِن سارے اختیارات کے ساتھ اُسے خدا نے اپنی پیدا کردہ بے شمار مخلوقات پر تصرّف کرنے کا اقتدار دیا ہے اور وہ عملاً اس اقتدار کو استعمال کر رہا ہے۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد چہارم، المؤمن، حاشیہ ۹۱)۔

اِن دو باتوں سے جو اوپر بیان کی گئی ہیں بالکل ایک منطقی نتیجہ کے طور پر وہ تیسری بات خود بخود نکلتی ہے جو آیت کے تیسرے فقرے میں ارشاد ہوئی ہے کہ "اُسی کی طرف آخر کار تمہیں پلٹنا ہے"۔ ظاہر بات ہے کہ جب ایسے ایک حکیمانہ اور بامقصد نظامِ کائنات میں ایسی ایک با اختیار مخلوق پیدا کی گئی ہے تو حکمت کا تقاضا ہرگز یہ نہیں ہے کہ اسے یہاں شترِ بے مہار کی طرح غیر ذمّہ دار بنا کر چھوڑ دیا جائے بلکہ لازماً اس کا تقاضا یہ ہے کہ یہ مخلوق اُس ہستی کے سامنے جواب دہ ہو جس نے اُسے اِن اختیارات کے ساتھ اپنی کائنات میں یہ مقام و مرتبہ عطا کیا ہے۔ "پلٹنے" سے مراد اِس آیت میں محض پلٹنا نہیں ہے بلکہ جواب دہی کے لیے پلٹنا ہے، اور بعد کی آیات میں صراحت کر دی گئی ہے کہ یہ واپسی اِس زندگی میں نہیں بلکہ مرنے کے بعد دوسری زندگی میں ہو گی، اور اِس کا اصل وقت وہ ہو گا جب پوری نوعِ انسانی کو از سرِ نو زندہ کر کے بیک وقت محاسبہ کے لیے اکٹھا کیا جائے گا، اور اُس محاسبے کے نتیجے میں جزا و سزا اس بنیاد پر ہو گی کہ آدمی نے خدا کے دیئے ہوئے اختیارات کو صحیح طریقے سے استعمال کیا یا غلط طریقے سے۔ رہا یہ سوال کہ یہ جواب دہی دنیا کی موجودہ زندگی میں کیوں نہیں ہو سکتی؟ اور اس کا صحیح وقت مرنے کے بعد دوسری زندگی ہی کیوں ہے؟ اور یہ کیوں ضروری ہے کہ یہ جواب دہی اُس وقت ہو جب پوری نوعِ انسانی اِس دنیا میں ختم ہو جائے اور تمام اوّلین و آخرین کو بیک وقت دوبارہ زندہ کر کے اکٹھا کیا جائے؟ آدمی ذرا بھی عقل سے کام لے تو وہ سمجھ سکتا ہے کہ یہ سب کچھ بھی سراسر معقول ہے اور حکمت و دانش کا تقاضا یہی ہے کہ محاسبہ دوسری زندگی ہی میں ہو اور سب انسانوں کا ایک ساتھ ہو۔ اِس کی پہلی وجہ یہ ہے کہ انسان اپنے پورے کارنامۂ حیات کے لیے جواب دہ ہے۔ اس لیے اس کی جواب دہی کا صحیح وقت لازماً وہی ہونا چاہیے جب اس کا کارنامۂ حیات مکمل ہو چکا ہو۔ اور دوسری

زمین اور آسمانوں کی ہر چیز کا اسے علم ہے، جو کچھ تم چھپاتے ہو اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو[۸] سب اس کو معلوم ہے، اور وہ دلوں کا حال تک جانتا ہے[۹]۔

وجہ اِس کی یہ ہے کہ انسان اُن تمام اثرات و نتائج کے لیے ذمّہ دار ہے جو اس کے افعال سے دوسروں کی زندگی پر مترتب ہوتے ہیں، اور وہ اثرات و نتائج اُس کے مرنے کے ساتھ ختم نہیں ہو جاتے بلکہ اس کے بعد مدتہائے دراز تک چلتے رہتے ہیں، لہٰذا صحیح محاسبہ اُسی وقت ہو سکتا ہے جب پُوری نوع انسانی کا کارنامۂ حیات ختم ہو جائے اور تمام اوّلین و آخرین بیک وقت جواب دہی کے لیے جمع کیے جائیں۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم، الاعراف، حاشیہ ۳۰۔ یونس، حواشی ۱۰-۱۱۔ ہود، حاشیہ ۱۰۵۔ النحل، حاشیہ ۳۵۔ جلد سوم، الحج، حاشیہ ۹۔ النمل، حاشیہ ۲۷۔ الروم، حواشی ۵-۶۔ جلد چہارم، صٓ، حواشی ۲۹-۳۰۔ المومن، حاشیہ ۸۰۔ الجاثیہ، حواشی ۲۷ تا ۲۹)۔

[۸] دوسرا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "جو کچھ تم چھپ کر کرتے ہو اور جو کچھ تم علانیہ کرتے ہو"۔

[۹] یعنی وہ انسان کے صرف اُن اعمال ہی سے واقف نہیں ہے جو لوگوں کے علم میں آجاتے ہیں بلکہ ان اعمال کو بھی جانتا ہے جو سب سے مخفی رہ جاتے ہیں۔ مزید براں وہ محض اعمال کی ظاہری شکل ہی کو نہیں دیکھتا بلکہ یہ بھی جانتا ہے کہ انسان کے ہر عمل کے پیچھے کیا ارادہ اور کیا مقصد کارفرما تھا اور جو کچھ اس نے کیا کس نیت سے کیا اور کیا سمجھتے ہوئے کیا۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس پر انسان غور کرے تو اسے اندازہ ہو سکتا ہے کہ انصاف صرف آخرت ہی میں ہو سکتا ہے اور صرف خدا ہی کی عدالت میں صحیح انصاف ہونا ممکن ہے۔ انسان کی عقل خود یہ تقاضا کرتی ہے کہ آدمی کو اُس کے ہر جُرم کی سزا ملنی چاہیے، لیکن آخر یہ بات کون نہیں جانتا کہ دنیا میں اکثر و بیشتر جرائم یا تو چھُپے رہ جاتے ہیں، یا اُن کے لیے کافی شہادت بہم نہ پہنچنے کی وجہ سے مجرم چھُوٹ جاتا ہے، یا جُرم کھُل بھی جاتا ہے تو مجرم اتنا بااثر اور طاقتور ہوتا ہے کہ اسے سزا نہیں دی جا سکتی۔ پھر انسان کی عقل یہ بھی چاہتی ہے کہ آدمی کو محض اس بنا پر سزا نہیں ملنی چاہیے کہ اس کے فعل کی صورت ایک مجرمانہ فعل کی سی ہے، بلکہ یہ تحقیق ہونا چاہیے کہ جو فعل اس نے کیا ہے بالارادہ سوچ سمجھ کر کیا ہے، اس کے ارتکاب کے وقت وہ ایک ذمّہ دار عامل کی حیثیت سے کام کر رہا تھا، اس کی نیت فی الواقع ارتکابِ جُرم ہی کی تھی، اور وہ جانتا تھا کہ جو کچھ وہ کر رہا ہے وہ جُرم ہے۔ اسی لیے دنیا کی عدالتیں مقدمات کا فیصلہ کرنے میں اِن امور کی تحقیق کرتی ہیں اور اِن کی تحقیق کو اصُولِ انصاف کا تقاضا مانا جاتا ہے۔ مگر کیا واقعی دنیا میں

کیا نہیں اُن لوگوں کی کوئی خبر نہیں پہنچی جنہوں نے اِس سے پہلے کُفر کیا اور پھر اپنی شامتِ اعمال کا مزہ چکھ لیا؟ اور آگے ان کے لیے ایک دردناک عذاب ہے[۱۰]۔ اِس انجام کے مستحق وہ اس لیے ہوئے کہ اُن کے پاس اُن کے رسول کھُلی کھُلی دلیلیں اور نشانیاں لے کر آتے رہے[۱۱]، مگر اُنہوں نے کہا: "کیا انسان ہمیں ہدایت

کوئی ذریعہ ایسا پایا جاتا ہے جس سے ان کی ٹھیک ٹھیک تحقیق ہو سکے جو ہر شُبہ سے بالاتر ہو؟ اِس لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ آیت بھی اللہ تعالیٰ کے اِس ارشاد سے گہرا منطقی ربط رکھتی ہے کہ "اُس نے زمین اور آسمانوں کو برحق پیدا کیا ہے"۔ برحق پیدا کرنے کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ اس کائنات میں صحیح اور کامل عدل ہو۔ یہ عدل لازماً اُسی صورت میں قائم ہو سکتا ہے جبکہ عدل کرنے والے کی نگاہ سے انسان جیسی ذمّہ دار مخلوق کا نہ صرف یہ کہ کوئی فعل چھُپا نہ رہ جائے بلکہ وہ نیّت بھی اس سے مخفی نہ رہے جس کے ساتھ کسی شخص نے کوئی فعل کیا ہو۔ اور ظاہر ہے کہ خالقِ کائنات کے سوا کوئی دوسری ہستی ایسی نہیں ہو سکتی جو اس طرح کا عدل کر سکے۔ اب اگر کوئی شخص اللہ اور آخرت کا انکار کرتا ہے تو وہ گویا یہ دعویٰ کرتا ہے کہ ہم ایک ایسی کائنات میں رہتے ہیں جو فی الحقیقت انصاف سے خالی ہے، بلکہ جس میں سرے سے انصاف کا کوئی امکان ہی نہیں ہے۔ اس احمقانہ تخیّل پر جس شخص کی عقل اور جس کا قلب و ضمیر مطمئن ہو وہ بڑا ہی بے شرم ہے اگر اپنے آپ کو ترقی پسند یا عقلیت پسند سمجھتا ہو اور اُن لوگوں کو تاریک خیال یا رجعت پسند سمجھے جو کائنات کے اِس انتہائی معقول (RATIONAL) تصوّر کو قبول کرتے ہیں جسے قرآن پیش کر رہا ہے۔

۱۰ یعنی دنیا میں انہوں نے شامتِ اعمال کا جو مزا چکھا وہ ان کے جرائم کی نہ اصل سزا تھی نہ پوری سزا۔ اصلی اور پوری سزا تو ابھی آخرت میں اُن کو بھگتنی ہے۔ لیکن دُنیا میں جو عذاب ان پر آیا اس سے لوگ یہ سبق لے سکتے ہیں کہ جن قوموں نے بھی اپنے رب کے مقابلے میں کُفر کا رویّہ اختیار کیا وہ کس طرح بگڑتی چلی گئیں اور آخر کس انجام سے دوچار ہوئیں۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم، الاعراف، حاشیہ ۵-۶۔ ہود، حاشیہ ۱۰۵)۔

۱۱ اصل میں لفظ بیّنات استعمال ہُوا ہے جس کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ بیّن عربی زبان میں ایسی چیز کو کہتے ہیں جو بالکل ظاہر اور واضح ہو۔ انبیاء علیہم السلام کے متعلق یہ فرمانا کہ وہ بیّنات لے کر آتے رہے، یہ معنی رکھتا ہے کہ ایک تو وہ ایسی صریح علامات اور نشانیاں لے کر آتے تھے جو ان کے مامور من اللہ ہونے کی کھلی کھلی شہادت دیتی تھیں۔ دوسرے، وہ جو بات بھی پیش کرتے تھے نہایت معقول اور روشن دلیلوں کے ساتھ پیش کرتے تھے۔ تیسرے،

دیں گے؟"[۱۲] اس طرح انہوں نے ماننے سے انکار کر دیا اور منہ پھیر لیا، تب اللہ بھی ان سے بے پروا ہو گیا اور اللہ تو ہے ہی بے نیاز اور اپنی ذات میں آپ محمود۔[۱۳]

ان کی تعلیم میں کوئی ابہام نہ تھا، بلکہ وہ صاف صاف بتاتے تھے کہ حق کیا ہے اور باطل کیا، جائز کیا ہے اور ناجائز کیا، کس راہ پر انسان کو چلنا چاہیے اور کس راہ پر نہ چلنا چاہیے۔

[۱۲] یہ تھی ان کی تباہی کی اولین اور بنیادی وجہ۔ نوعِ انسانی کو دنیا میں صحیح راہِ عمل اس کے بغیر معلوم نہیں ہو سکتی تھی کہ اُس کا خالق اسے صحیح علم دے، اور خالق کی طرف سے علم دیئے جانے کی عملی صورت اس کے سوا کچھ نہ ہو سکتی تھی کہ وہ انسانوں ہی میں سے بعض افراد کو علم عطا کر کے دوسروں تک اسے پہنچانے کی خدمت سپرد کرے۔ اس غرض کے لیے اُس نے انبیاء کو بیّنات کے ساتھ بھیجا تاکہ لوگوں کے لیے ان کے برحق ہونے میں شک کرنے کی کوئی معقول وجہ نہ رہے۔ مگر انہوں نے سرے سے یہی بات ماننے سے انکار کر دیا کہ بشر خدا کا رسول ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد ان کے لیے ہدایت پانے کی کوئی صورت باقی نہ رہی۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد چہارم، سورۂ یٰسین، حاشیہ ۱۱)۔ اس معاملہ میں گمراہ انسانوں کی جہالت و نادانی کا یہ عجیب کرشمہ ہمارے سامنے آتا ہے کہ بشر کی رہنمائی قبول کرنے میں تو انہوں نے کبھی تامل نہیں کیا ہے، حتیٰ کہ انہی کی رہنمائی میں لکڑی اور پتھر کے بتوں تک کو معبود بنایا، خود انسانوں کو خدا اور خدا کا اوتار اور خدا کا بیٹا تک مان لیا، اور گمراہ کن لیڈروں کی اندھی پیروی میں ایسے ایسے عجیب مسلک اختیار کر لیے جنہوں نے انسانی تہذیب و تمدن اور اخلاق کو تلپٹ کر کے رکھ دیا۔ مگر جب خدا کے رسول اُن کے پاس حق لے کر آئے اور انہوں نے ہر ذاتی غرض سے بالاتر ہو کر بے لاگ سچائی ان کے سامنے پیش کی تو انہوں نے کہا "کیا اب بشر ہمیں ہدایت دیں گے؟" اس کے معنی یہ تھے کہ بشر اگر گمراہ کرے تو سر آنکھوں پر، لیکن اگر وہ راہِ راست دکھاتا ہے تو اس کی رہنمائی قابلِ قبول نہیں ہے۔

[۱۳] یعنی جب انہوں نے اللہ کی بھیجی ہوئی ہدایت سے استغنا برتا تو پھر اللہ کو بھی اس کی کچھ پروا نہ رہی کہ وہ کس گڑھے میں جا کر گرتے ہیں۔ اللہ کی کوئی غرض تو اُن سے اٹکی ہوئی نہ تھی کہ وہ اسے خدا مانیں گے تو وہ خدا رہے گا ورنہ خدائی کا تخت اس سے چھن جائے گا۔ وہ نہ ان کی عبادت کا محتاج تھا، نہ ان کی حمد و ثنا کا۔ وہ تو

مُنکرین نے بڑے دعوے سے کہا ہے کہ وہ مرنے کے بعد ہرگز دوبارہ نہ اٹھائے جائیں گے[۱۴]۔ ان سے کہو "نہیں، میرے رب کی قسم تم ضرور اٹھائے جاؤ گے،[۱۵] پھر ضرور تمہیں بتایا جائے گا کہ تم نے (دنیا میں) کیا کچھ

ان کی اپنی بھلائی کے لیے انہیں راہِ راست دکھانا چاہتا تھا۔ مگر جب وہ اُس سے مُنہ پھیر گئے تو اللہ بھی اُن سے بے پروا ہو گیا۔ پھر نہ ان کو ہدایت دی، نہ ان کی حفاظت اپنے ذمّہ لی، نہ ان کو ہلاکت میں پڑنے سے بچایا اور نہ تباہی اپنے اوپر لانے سے روکا، کیونکہ وہ خود اس کی ہدایت اور ولایت کے طالب نہ تھے۔

۱۴؎ یعنی ہر زمانے میں منکرینِ حق دوسری جس بنیادی گمراہی میں مبتلا رہے ہیں، اور جو بالآخر ان کی تباہی کی موجب ہوئی، وہ یہ تھی۔ اگرچہ کسی منکرِ آخرت کے پاس نہ پہلے یہ جاننے کا کوئی ذریعہ تھا، نہ آج ہے، نہ کبھی ہو سکتا ہے کہ مرنے کے بعد کوئی دوسری زندگی نہیں ہے۔ لیکن اِن نادانوں نے ہمیشہ بڑے زور کے ساتھ یہی دعویٰ کیا ہے، حالانکہ قطعیت کے ساتھ آخرت کا انکار کر دینے کے لیے نہ کوئی عقلی بنیاد موجود ہے نہ علمی بنیاد۔

۱۵؎ یہ تیسرا مقام ہے جہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ سے فرمایا ہے کہ اپنے رب کی قسم کھا کر لوگوں سے کہو کہ ضرور ایسا ہو کر رہے گا۔ پہلے سورۂ یونس میں فرمایا وَيَسْتَنْبِئُونَكَ أَحَقٌّ هُوَ ۖ قُلْ إِي وَرَبِّي إِنَّهُ لَحَقٌّ ۖ وَمَا أَنتُم بِمُعْجِزِينَ "وہ پوچھتے ہیں کیا واقعی یہ حق ہے؟ کہو، میرے رب کی قسم یہ یقیناً حق ہے اور تم اتنا بل بوتا نہیں رکھتے کہ اسے ظہور میں آنے سے روک دو" (آیت ۵۳)۔ پھر سورۂ سبا میں فرمایا وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَأْتِينَا السَّاعَةُ ۖ قُلْ بَلَىٰ وَرَبِّي لَتَأْتِيَنَّكُمْ "منکرین کہتے ہیں کیا بات ہے کہ قیامت ہم پر نہیں آ رہی ہے! کہو، قسم ہے میرے رب کی وہ تم پر آ کر رہے گی" (آیت ۳)۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک منکرِ آخرت کے لیے آخر اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ آپ اسے آخرت کے آنے کی خبر قسم کھا کر دیں یا قسم کھائے بغیر دیں؟ وہ جب اِس چیز کو نہیں مانتا تو محض اس بنا پر کیسے مان لے گا کہ آپ قسم کھا کر اس سے یہ بات کہہ رہے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اوّل تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مُخاطب وہ لوگ تھے جو اپنے ذاتی علم اور تجربے کی بنا پر یہ بات خوب جانتے تھے کہ یہ شخص کبھی عمر بھر جھوٹ نہیں بولا ہے، اس لیے چاہے زبان سے وہ آپ کے خلاف کیسے ہی بہتان گھڑتے رہے ہوں، اپنے دلوں میں وہ یہ تصور تک نہ کر سکتے تھے کہ ایسا سچّا انسان کبھی خدا کی قسم کھا کر وہ بات کہہ سکتا ہے جس کے برحق ہونے کا اسے کامل یقین نہ ہو۔

کیا ہے[۵]۔ اور ایسا کرنا اللہ کے لیے بہت آسان ہے[۶]۔"

دوسرے یہ کہ آپ محض آخرت کا عقیدہ ہی بیان نہیں کرتے تھے، بلکہ اس کے لیے نہایت معقول دلائل بھی پیش فرماتے تھے۔ مگر جو چیز نبی اور غیر نبی کے درمیان فرق کرتی ہے وہ یہ ہے کہ ایک غیر نبی آخرت کے حق میں جو مضبوط سے مضبوط دلائل دے سکتا ہے ان کا زیادہ سے زیادہ فائدہ بس یہی ہو سکتا ہے کہ آخرت کے نہ ہونے کی بہ نسبت اس کا ہونا معقول تر اور اغلب تسلیم کر لیا جائے۔ اس کے برعکس نبی کا مقام ایک فلسفی کے مقام سے بالاتر ہے۔ اس کی اصل حیثیت یہ نہیں ہے کہ عقلی استدلال سے وہ اس نتیجہ پر پہنچا ہو کہ آخرت ہونی چاہیے۔ بلکہ اس کی اصل حیثیت یہ ہے کہ وہ اس بات کا علم رکھتا ہے کہ آخرت ہو گی اور یقین کے ساتھ کہتا ہے کہ وہ ضرور ہو کر رہے گی۔ اس لیے ایک نبی ہی قسم کھا کر یہ بات کہہ سکتا ہے، ایک فلسفی اس پر قسم نہیں کھا سکتا۔ اور آخرت پر ایمان ایک نبی کے بیان ہی سے پیدا ہو سکتا ہے۔ فلسفی کا استدلال اپنے اندر یہ قوت نہیں رکھتا کہ دوسرا شخص تو درکنار، فلسفی خود بھی اپنی دلیل کی بنا پر اسے اپنا ایمانی عقیدہ بنا سکے۔ فلسفی اگر واقعی صحیح الفکر فلسفی ہو تو وہ "ہونا چاہیے" سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ "ہے اور یقیناً ہے" کہنا صرف ایک نبی کا کام ہے۔

[۶] یہ وہ مقصد ہے جس کے لیے بنی آدم کو مرنے کے بعد دوبارہ اٹھایا جائے گا، اور اسی میں اس سوال کا جواب بھی ہے کہ ایسا کرنے کی آخر ضرورت کیا ہے۔ اگر وہ بحث آدمی کی نگاہ میں ہو جو سورۃ کے آغاز سے آیت نمبر ۲ تک کی گئی ہے تو یہ بات بآسانی سمجھ میں آ جاتی ہے کہ اس برحق کائنات میں جس مخلوق کو کفر و ایمان میں سے کسی ایک راہ کے اختیار کرنے کی آزادی دی گئی ہو، اور جسے اس کائنات میں بہت سی چیزوں پر تصرف کا اقتدار بھی عطا کیا گیا ہو، اور جس نے کفر یا ایمان کی راہ اختیار کر کے عمر بھر اپنے اس اقتدار کو صحیح یا غلط طریقے سے استعمال کر کے بہت سی بھلائیاں یا بہت سی برائیاں خود اپنی ذمہ داری پر کی ہوں، اس کے بارے میں یہ تصور کرنا انتہائی غیر معقول ہے کہ یہ سب کچھ جب وہ کر چکے تو آخر کار بھلے کی بھلائی اور برے کی برائی، دونوں بے نتیجہ رہیں اور سرے سے کوئی وقت ایسا آئے ہی نہیں جب اس مخلوق کے اعمال کی جانچ پڑتال ہو۔ جو شخص ایسی غیر معقول بات کہتا ہے وہ لامحالہ دو حماقتوں میں سے ایک حماقت کا ارتکاب کرتا ہے۔ یا تو وہ یہ سمجھتا ہے کہ یہ کائنات ہے تو مبنی برحکمت، مگر یہاں انسان جیسی با اختیار مخلوق کو غیر ذمہ دار بنا کر چھوڑ دیا گیا ہے۔ یا پھر وہ یہ سمجھتا ہے کہ

(باقی صفحہ ۶۴ پر)

ترکی میں تحریکِ احیائے اسلام کی موجودہ حالت

دورۂ ترکی کے مشاہدات

از جناب خلیل حامدی صاحب

(۴)

استنبول کا منظر استنبول کا منظر عجیب دلفریب اور مسحور کُن ہے۔ سامنے آبنائے باسفورس ہے اور آبنائے کے اُس پار اسکودار یعنی ایشیائی استنبول۔ دائیں ہاتھ آبنائے باسفورس کے اندر سے ایک خلیج (گولڈن ہارن) نکل رہی ہے جو یورپی استنبول میں داخل ہوتی ہے اور بیوغلو کو فاتح سے جُدا کرتی ہوئی ۵ میل تک اندر چلی جاتی ہے۔ پُشت پر بیوغلو ہے۔ جدھر دیکھیں ساحل ہی ساحل ہے۔ شہر کی روشنیاں آبنائے باسفورس، گولڈن ہارن اور مرمرہ کے سبز اور نیلگوں پانیوں کے اندر عکس ریز ہو رہی ہیں۔ نیل کے ساحل بھی دیکھے ہیں۔ بیروت کو بھی بحرِ ابیض کے اندر ضَو بار دیکھا ہے۔ مشرق میں اِن دونوں مقاموں کی دُھوم ہے۔ مگر استنبول کا یہ منظر دونوں کو مات کر رہا ہے۔ اہلِ مغرب اسے دنیا کی جنت سے تعبیر کرتے ہیں۔ تُرک قوم پرست اِسے "وطن کی زینت اور تاریخی ثروت" قرار دیتے ہیں۔ مؤرخین کے الفاظ میں یہ تاریخ کا مہد (گہوارہ) بھی ہے اور تاریخ کی لحد (مدفن) بھی۔ خلافتِ عثمانی کے طویل دَور میں ملّتِ اسلامی کا بالاتفاق یہ فیصلہ رہا کہ استنبول اسلام کی آنکھوں کی ٹھنڈک، مجاہدین کی کچھار اور اہلِ نظر کا آستانہ ہے۔ نائف آفندی نے ایشیائی ساحل کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ سامنے کی طرف جو قلعہ نظر آ رہا ہے یہ محمد الفاتح نے بنایا تھا۔ محمد الفاتح نے جب قسطنطنیہ کی فتح کا ارادہ کیا تو اس کے لیے مختلف تدابیر اختیار کیں۔ اُن میں سے ایک یہ قلعہ ہے۔ آبنائے باسفورس کے نیلگوں پانی پر جب نظر ڈالی تو دیکھا کہ متعدد جہاز حرکت میں ہیں اور خاصی چہل پہل ہے۔ ان میں کچھ جہاز تو مقامی ہیں اور یہاں کی تمام آبادی کی نقل و حرکت کے لیے مخصوص ہیں۔ اور کچھ غیر ملکی ہیں۔ نائف صاحب اور دوسرے ساتھی جہازوں کی نقل و حرکت

کا دیر تک جائزہ لیتے رہے اور آپس میں ترکی زبان میں تبصرے کرتے رہے پھر خود ہی مجھے بھی رازدارانہ طریقے سے بتانے لگے کہ آج کل رُوس کے جنگی جہاز یہاں سے بالعموم گزرتے رہتے ہیں۔ رُوس کا جو جنگی بیڑہ اس وقت بحرِ ابیض میں ہے اُس کی سپلائی مسلسل جاری ہے۔ مَیں نے مزاحاً اُن سے کہا کہ جن عربوں کی خاطر آپ نے رُوس کے لیے یہ آبی شاہراہ کھولی ہے وہ تو آپ کے دشمنوں کو آپ کے خلاف فوجی امداد دیتے رہے ہیں۔ پروفیسر عُزَیر نے فوراً میرا اشارہ بھانپ لیا اور معاً جواب دیا کہ کیا عرب لیڈروں کی غلطیوں کا انتقام ہم عرب عوام سے لیں؟ عرب عوام مسلمان ہیں اور ہمارے بھائی ہیں۔ ہم اُن کے غم والم میں برابر کے شریک ہیں۔ شیخ یُوسف نے تو یہاں تک حسبِ معمول جذباتی انداز میں کہہ دیا کہ اگر فلسطینی چھاپہ مار مجھے لینے کے لیے تیار ہوں تو مَیں آج ہی تمام کاروبار ختم کر کے اسرائیلیوں کے خلاف لڑنے کے لیے تیار ہوں۔ اپنی حکومت کی عرب نواز پالیسی پر یہ لوگ بہت مطمئن تھے اور سلیمان دَمیرل کے حق میں اچھے جذبات کا اظہار کرتے رہے۔

کنارِ آبِ جُو: پہاڑی سے ہم بڑی مشکل سے موٹر کو اتار سکے۔ شیخ یوسف نے جوشِ محبت میں پہاڑی پر موٹر کو چڑھا تو دیا تھا مگر راستہ بہت خراب تھا۔ اُترتے ہوئے سخت تکلیف ہوئی۔ پہاڑ سے اُتر کر ہم آبنائے باسفورس کے ساحل کے ساتھ ساتھ ہو لیے تاکہ آبنائے کا قریب سے نظارہ دیکھیں۔ سڑک ساحل سے اِس قدر متصل ہے کہ اس پر لبِ ساحل کا اطلاق محاورۃً نہیں حقیقتاً ہوتا ہے۔ سڑک کے ایک طرف کنارۂ سمندر۔ دوسری طرف محلات کا سلسلۂ طویل۔ اور محلات بھی قدیم اور ساخت کے لحاظ سے عجوبۂ روزگار۔ نائف آفندی میری وضاحت طلب نظروں کو دیکھ کر بتانے لگے کہ یہ محلات مختلف عثمانی حکام کے ہیں۔ عثمانی اُمراء اور بیگمات گرمیوں کے ایام میں اِن محلات میں منتقل ہو جاتی تھیں۔ چنانچہ ان کی تعمیر میں اِس بات کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ بالاخانوں کے اندر بیٹھنے والے باہر کے نظارے سے پُوری طرح لُطف اندوز ہو سکیں مگر باہر سے اندر کی کوئی چیز نظر نہ آئے۔ یہ محلات اپنی کہنگی کے باوجود نہایت دیدہ زیب اور جاذبِ نگاہ ہیں۔ تُرکوں کے طرزِ تعمیر کو دنیا نے سراہا ہے۔ بلکہ تاریخ میں اُن کے طرزِ تعمیر کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکا۔ اس بارے میں اُن کے ذوقِ بلند اور مہارتِ فن نے بڑی جولانیاں دکھائی ہیں۔ عمارات کی تعمیر میں عثمانی آرٹ کی نمایاں خوبیاں ایسی ہیں کہ آج بھی اُن کی باقیات کو دیکھ کر دُنیا انگشت بدنداں ہے۔ عمارات کی تعمیر میں عثمانی آرٹ کی نمایاں خوبیاں یہ ہیں کہ یہ عمارات مضبوطی و استحکام میں بے نظیر ہیں نزاکت، دلآویزی اور نقش ونگار کے لحاظ سے لاجواب۔ موسمی تغیرات کا سامنا کرنے ←

کے لیے حد درجہ موزوں ۔ اور اسلام کے اصولِ معاشرت اور اسلامی آداب و قیود کے عین مطابق ۔ عثمانی عمارتوں کو دیکھ کر انسان بآسانی اندازہ لگا سکتا ہے کہ ترکوں کی تہذیب میں حیا، شرافت، پاکیزگی اور غیرت کو کس درجہ پذیرائی حاصل تھی ۔

چلتے چلتے ہم ایک قہوہ خانہ پر جا کر رُک گئے ۔ آبنائے باسفورس کا یہ نہایت مشہور و معروف ساحلی قہوہ خانہ ہے ۔ اس کا نام ہے قہوہ امیر خان ۔ بہت پرانے اور تاریخی قہوہ خانوں میں سے ہے اور قاہرہ کے محلہ خان الخلیلی کے قہوہ خانوں کا ہم عصر ۔ یہاں کی چائے اور ثعلب بہت مشہور ہے ۔ ان کی خاطر دور دراز سے لوگ آتے ہیں ۔ ثعلب ہمارے ہاں کی فرنی اور عربوں کی مُحَلَّبیہ سے ملتی جُلتی ایک چیز ہے ۔ نائف آفندی کہنے لگے قہوہ امیر خان کے بارے میں یہاں مشہور ہے کہ اگر کسی شخص کی عقل کام نہ کر رہی ہو تو اس قہوہ خانے میں کچھ وقت گزار جائے ۔ یہاں کے قہوہ اور ثعلب سے بھی شاد کام ہوا اور آبنائے باسفورس کی نیلگوں موجوں سے بھی محظوظ ۔ عثمانی دور میں اُمراء اور حکام تک قہوہ امیر خان میں آتے تھے اور عام آدمیوں کے ساتھ بیٹھ کر وقت گزارتے تھے ۔ اس قہوہ خانہ کو بعض سلاطینِ آلِ عثمان کی پذیرائی کا شرف بھی حاصل رہا ہے ۔

نائف آفندی مجھ سے پوچھنے لگے کہ ہماری ثعلب آپ کو پسند آئی ؟ راقم الحروف نے عرض کیا کھانے پینے کی چیزوں کے بارے میں میری پسند و ناپسند ناقابلِ اعتبار ہے ۔ آپ کی ثعلب کے بارے میں اصل فیصلہ مولانا مودودی کر سکتے ہیں ۔ کہنے لگے کہ ہم نے آج سے تہیہ کر لیا ہے کہ مولانا مودودی اگر ترکی آئے تو انہیں ایک رات یہاں ضرور لائیں گے ۔ اور پھر مسکرا کر کہنے لگے کہ " اسد (شیر) کجا اور ثعلب (لومڑی) کجا" ۔ یہ فقرہ دوستوں کے لیے کافی دیر تک دل لگی کا موضوع بنا رہا ۔

پورے ساحل پر ایک اور عجیب منظر دیکھا ۔ مچھیروں نے پانی میں جال ڈال رکھے تھے اور خوب ہنگامہ برپا کر رکھا تھا ۔ چونکہ ساتھ ساتھ مچھلی فروخت ہو رہی تھی اس لیے ہنگامہ آرائی نے پورے ساحل کو مچھلی مارکیٹ بنا رکھا تھا ۔ مچھیرے چھوٹے چھوٹے اسٹیمروں پر سوار تھے ۔ اسٹیمروں کے اندر ہی بیٹھ کر انہوں نے بڑے بڑے جال پانی میں ڈال رکھے تھے ۔ ایک میل کے فاصلہ تک پانی کے اندر اسٹیمر ہی اسٹیمر دوڑتے پھر رہے تھے ۔ اور جو مچھلی ان کے ذریعہ شکار کی جاتی تھی اُسے کنارے پر ڈھیر کرتے جاتے تھے ۔ دلال بھی موقع پر موجود تھے ۔

مچھلی کا شکار اور اس کی تھوک کے حساب سے فروخت بیک وقت جاری تھی۔ اس شدید سردی میں جبکہ اعضائے جسم یخ ہو رہے تھے ترکی مچھیروں کی اس جفاکشی اور سخت جانی پر طبیعت عش عش کر اٹھی۔ ترکی قوم مجموعی طور پر نہایت فعال اور محنت کش قوم ہے اور اس لحاظ سے پاکستانی قوم سے بہت حد تک مشابہت رکھتی ہے۔ ترکوں کی اس جفاکشی کا ضرورت سے زیادہ احساس اس لیے بھی ہو رہا ہے کہ ابھی ابھی سعودی عرب کی سہل انگار اور سست رو قوم کو دیکھ کر آیا ہوں۔ ساحل وہاں بھی ہیں مگر اُن سے استفادہ کرنے والے خال خال۔ نائف آفندی نے بتایا کہ مچھلی ہماری قومی آمدنی کا ایک معقول ذریعہ ہے۔ ایک طرف انسانوں کا گروہ کثیر مچھلی کے شکار میں مگن تھا اور دوسری طرف پرندوں، بطخوں اور مرغابیوں کے جھنڈ کے جھنڈ سطح آب پر تیرتے پھر رہے تھے اور اُسی انداز سے شور مچا رہے تھے جس انداز سے ماہی گیروں نے مچا رکھا تھا۔ جو مچھلی انسانوں کی گرفت سے بچ جاتی وہ اس مخلوق کا لقمہ بن جاتی۔ قرآن کی یہ آیت بے ساختہ زبان پر آتی رہی کہ وَهُوَ الَّذِي سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ لِتَأْكُلُوا مِنْهُ لَحْمًا طَرِيًّا وَتَسْتَخْرِجُوا مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُونَهَا وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيهِ وَلِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ (النحل-۱۴)۔

اسلامی اخوت کے مظاہر واپسی کے وقت وہ کٹھن راستہ ہم نے ترک کر دیا جس سے آئے تھے بلکہ ساحل کے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ کافی رات ہو چکی تھی۔ سردی کی شدت سے دنیا اپنے اپنے ٹھکانوں میں سر چھپائے پڑی تھی۔ راستے میں شیخ یوسف نے ایک ریستوران کے سامنے موٹر روک لی اور دعوت دی کہ کھانا کھایا جائے۔ مَیں سوءِ ہضم میں مبتلا ہو چکا تھا۔ ساتھیوں نے بہت اصرار کیا کہ مَیں کچھ نہ کچھ ضرور کھاؤں مگر مَیں نے عرض کیا کہ کھانا کھانے کے بجائے دوا کھانے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے، کیونکہ معدہ روزروں کی وجہ سے اور مسلسل آب و ہوا کی تبدیلی سے بے حد متاثر ہو چکا ہے۔ مَیں نے اپنی یہ کیفیت کھانے کے لیے اُن کے اصرار سے بچنے کی وجہ سے سادگی سے بیان کر دی مگر شیخ یوسف یہ سنتے ہی اُٹھے اور ہمیں ریستوران میں چھوڑ موٹر لے کر ڈاکٹر کی تلاش میں نکل گئے۔ مَیں نے جب اُن کے فوری غیاب کی وجہ دریافت کی تو نائف آفندی نے بتایا کہ وہ آپکی تکلیف کا حال سُنکر دوا کی تلاش میں نکل گئے ہیں۔ مجھے یہ سُن کر شدید ندامت ہوئی۔ رات خوب بھیگ چکی ہے۔ برفباری کا وقت ہے۔ شہر میں ہُو کا عالم ہے۔ شیخ یوسف کو یہ کیا سوجھی کہ آؤ دیکھا نہ تاؤ معمولی سی تکلیف کی خاطر تلاش طبیب میں نکل کھڑے ہوئے۔ دس پندرہ منٹ مشکل گزرے ہونگے کہ وہ دواؤں کا لفافہ ہاتھ میں لیے ریستوران میں

داخل ہوئے۔ میں نے وفورِ تشکر سے دواؤں کا لفافہ وصول کر لیا مگر اس اعتذار اور ندامت کے ساتھ کہ میں آپ کے لیے ناحق تکلیف کا سبب بن گیا
شیخ یوسف کہنے لگے کہ رمضان المبارک میں دوا رات کو ہی کھائی جا سکتی ہے اسلیے اگر دوا نہ لیتے تو کل شام تک ٹل جاتی اور مرض میں اضافہ ہوتا۔
ترکوں کی مہمان نوازی اور خاطرداری کی شہرت بہت سنی تھی مگر اب تو قدم قدم پر اس کا مشاہدہ اور تجربہ ہو رہا ہے۔ تعارف اور ملاقات کی مدت چوبیس گھنٹوں سے
زیادہ نہیں ہوتی ہے مگر آپس میں ایسی یگانگت اور قرب اور قلبی اتصال موجزن ہے کہ گویا ہم پہلے کسی دور میں اکٹھے رہ چکے ہیں اور ایک عارضی تفرقہ فراق کے
دوبارہ ملنے کا موقع نصیب ہو گیا ہے۔ درحقیقت یہ وہ روحانی وحدت ہے جو صرف اسلام کی بدولت حاصل ہو سکتی ہے اور جس پر زبان اور رنگ کا اختلاف
اور نسل و وطن کی بیگانگی اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ اس وحدت پر مستزاد وہ تحریکی و نظریاتی ہم آہنگی ہے جو میرے اور ان کے درمیان پائی جاتی
ہے۔ میں جب یہ کہتا ہوں کہ میرا جماعت اسلامی سے تعلق ہے اور مولانا مودودی کا میں سکرٹری اور ان کی کتابوں
کا مترجم ہوں تو وہ محبت سے بے قابو ہو جاتے ہیں اور میری یہ نسبت ان کی غیر معمولی الفت و موانست کا مرکز بن جاتی

یہ ریستوران جس میں ہم بیٹھے ہیں اس کے مالک وہی بزرگ ہیں جنہوں نے آج مدرسہ امام و خطیب کے طلبہ و
اساتذہ کی افطاری کا انتظام کیا تھا۔ بڑے صاحبِ ثروت ہیں۔ اس ریستوران کے علاوہ اور بھی متعدد تجارتی اداروں
کے مالک ہیں۔ مگر مزاج و طبیعت کے لحاظ سے انکساری سادگی، تواضع اور درویش منشی کا پیکر ہیں۔ ریستوران کے
اندر انہوں نے یہ اعلان آویزاں کر رکھا ہے کہ مدرسہ امام و خطیب کے طلبہ و اساتذہ اور دوسرے مفتیوں اور
اماموں کے لیے یہ خصوصی رعایت ہے کہ ان سے کھانے کے ۲۵ فیصد دام کم لیے جائیں گے۔ یہ ریستوران
استنبول کے اعلیٰ درجے کے ریستورانوں میں شمار ہوتا ہے۔ گولڈن ہارن کے کنارے واقع ہے۔ سیاحوں اور
عام شہریوں کا ہر وقت جمگھٹا رہتا ہے۔ نظافت اور صفائی میں ترکوں کے ذوقِ نفیس کا آئینہ ہے۔ کمرے
کشادہ اور نشستیں نہایت آرام دہ اور خوبصورت ہیں۔ اور خدمتگار چاق و چوبند۔ ساتھیوں نے بتایا کہ
کھانوں کے لحاظ سے بھی اس کا معیار بہت بلند اور شہرت یافتہ ہے۔ اسلامی آداب کا بھی لحاظ رکھا جاتا ہے
ہر کمرے میں یہ دعا طغرے کی شکل میں آویزاں ہے کہ: "الحمد للہ الذی اطعمنا وسقانا وجعلنا من
المسلمین"۔ مزید معلوم ہوا کہ ریستوران کے مالک ترکی کی موجودہ اسلامی تحریک سے وابستہ ہیں اور ان
کا یہ ریستوران ہمیشہ اہلِ دعوت کی فرودگاہ بنا رہتا ہے۔

ترکستانی مسلمانوں کی مظلومی | اگلے دن صبح کے دس بجے عیسیٰ یوسف الپتگین ہوٹل میں تشریف لے آئے۔

رات انہوں نے ملاقات کا وعدہ لے لیا تھا۔ عیسیٰ یوسف ہمارے پرانے شناسا ہیں۔ ایک مرتبہ لاہور بھی تشریف لا چکے ہیں اور مولانا محترم سے ملاقات کر چکے ہیں۔ رابطۂ عالمِ اسلامی (مکہ مکرمہ) کے اجلاس کے دوران بھی ایک بار اُن سے ملاقات ہو چکی ہے۔ مشرقی ترکستان پر جب ۱۹۴۹ء میں چین کی کمیونسٹ حکومت نے زبردست فوجی کارروائی کے ساتھ قبضہ کر لیا تو موصوف وہاں سے پاکستان پہنچ گئے اور مختصر عرصہ کے قیام کے بعد پاکستان سے ترکی چلے گئے، پھر ترکی ہی کو اپنا دارالہجرت بنا لیا۔ موصوف برابر مسئلۂ ترکستان کے لیے سرگرمِ کار ہیں اور یہ اُن معدودے چند ترکستانیوں میں سے ہیں جو ترکستان کی آزادی کے لیے تڑپ رکھتے ہیں اور اس کے لیے عملاً جدوجہد کرتے رہتے ہیں۔ عیسیٰ یوسف صاحب نے آتے ہی پہلے مولانا محترم کی صحت کے بارے میں پوچھا اور پھر فرمانے لگے کہ ہم نے سُنا ہے کہ مولانا مودودی ترکی تشریف لا رہے ہیں۔ ہم اس موقع پر مشرقی ترکستان کے مہاجروں کا ایک عام اجتماع بلائیں گے تاکہ وہ مولانا محترم سے مل کر اُن کے سامنے ترکستان کا مسئلہ رکھیں۔ اِس غرض کے لیے انہوں نے مجھ سے وہ تاریخیں دریافت کیں جن میں مولانا محترم ترکی آئیں گے۔ لیکن میں نے انہیں بتایا کہ مَیں مولانا محترم سے رابطہ قائم کر رہا ہوں۔ اُن کی طرف سے جو جواب ملے گا اس کی روشنی میں آپ کوئی پروگرام تیار کریں۔

روس اور چین کا شکار "عظیم تر ترکستان" | عیسیٰ یوسف صاحب نے ابتدائی بات چیت کے بعد ترکستان اور ترکستانی مسلمانوں کی حکایتِ خونچکاں چھیڑ دی۔ اِدھر بھی سازِ دل تشنۂ مضراب تھا۔ شیخ عیسیٰ کی موجودگی سے پُورا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس داستان کی تفصیلات سُنیں، اور ترکستان کے اسلامی خطہ کے سقوط اور مہاجرینِ ترکستان کی سرگزشت سے آگاہی حاصل کی۔ دو گھنٹے تک شیخ عیسیٰ کے ساتھ اِس موضوع پر تبادلۂ خیال ہوتا رہا۔ شیخ عیسیٰ یوسف نے بتایا کہ ہم "عظیم تر ترکستان" (GREATER TURKISTAN) کے دعویدار ہیں۔ یہ "عظیم تر ترکستان" خالص اسلامی خطہ ہے۔ مگر اس پر اب دو استعماری طاقتوں، روس اور چین نے بجبر قبضہ کر رکھا ہے۔ اور ستم بالائے ستم یہ کہ مسلمان ممالک میں سے کسی ملک نے اِس قضیہ کو اپنے ہاتھ میں نہیں لیا۔ رابطۂ عالمِ اسلامی مکہ اور مؤتمر عالمِ اسلامی کراچی نے بھی اس مسئلہ کو قرارداد وں تک محدود رکھا ہے۔ ہر مسئلہ کی پُشت پر کوئی نہ کوئی طاقت موجود ہے، یہاں تک کہ تبت کے مسئلہ پر بدھ مذہب

کے پیرو باشندے اور حکومتیں موجود ہیں، مگر ترکستان مسلمان حکومتوں کی سیاسی مصلحتوں کی بھینٹ چڑھ گیا ہے اور آج تک یہ مسئلہ اقوامِ متحدہ کی میز تک نہیں پہنچ سکا۔ حالانکہ تبت کا مسئلہ اب تک تین بار ۱۹۵۹ء اور ۱۹۶۰ء اور ۱۹۶۵ء میں اقوامِ متحدہ میں موضوعِ بحث آچکا ہے اور بدھ حکومتوں کی تائید اور تھائی لینڈ، فلپائن اور آئرلینڈ کی حمایت حاصل کر چکا ہے۔ ترکستان کے حق میں اگر کہیں سے آواز بلند بھی ہوئی ہے تو وہ ترکستان کے مسلمانوں کی خاطر نہیں بلکہ مخصوص مفادات کے تقاضوں کے تحت بلند ہوئی ہے۔

"عظیم تر ترکستان" کی وضاحت کرتے ہوئے شیخ عیسیٰ نے بتایا کہ عظیم تر ترکستان سے مراد ترکستان کے دونوں حصے ہیں۔ مغربی ترکستان بھی جس پر روس قابض ہے اور مشرقی ترکستان بھی جسے چین نے ہڑپ کر رکھا ہے۔ مغربی ترکستان پر روسی کمیونسٹوں نے ۱۹۲۳ء میں قبضہ کیا اور مسلمانوں کے بڑے بڑے شہروں مثلاً بخارا (امام بخاریؒ کی جائے پیدائش)، سمرقند (تیمور لنگ کے دارالحکومت اور امام منصور ماتریدیؒ کی جائے سکونت)، افشنہ (ابن سینا کی جائے پیدائش)، تاشقند (جس کا قدیم نام شاش ہے اور اصول فقہ کی مشہور کتاب اصول الشاشی کے مصنف کا مولد ہے)، مرغینان (فقہ کی نامور کتاب ہدایہ کے مصنف، امام علی بن ابوبکر عبدالجلیل کے وطن)، نمنگان اور اندجان کو تہ و بالا کر کے رکھ دیا۔ مغربی ترکستان کا رقبہ ۴۰ لاکھ کیلو میٹر مربع ہے اور آبادی ۴ کروڑ کے لگ بھگ، یہ سب مسلمان ہیں۔ روس کی کمیونسٹ حکومت سے پہلے یہاں چار بڑی امارتیں قائم تھیں: امارتِ بخارا۔ امارتِ خیوہ (خوارزم)، امارتِ سمرقند اور امارتِ خوقند۔ کمیونسٹوں نے ان امارتوں کو ختم کر کے پورے مغربی ترکستان کے حصے بخرے کر دیئے اور یہ دیکھ کر کہ اتنے وسیع رقبہ پر تسلط قائم رکھنا مشکل ہوگا۔ اسے پانچ نام نہاد جمہوریتوں میں بانٹ دیا۔ یعنی ازبکستان، قازقستان، قرغیزستان، ترکمانستان اور تاجکستان۔ ان جمہوریتوں میں ایسا مستبدانہ نظام قائم کر دیا گیا کہ ایک علاقہ کے افراد دوسرے علاقہ کے افراد سے کلیۃً منقطع ہو گئے۔ حتیٰ کہ ان کے رسم الخط تک الگ الگ کر دیئے گئے حالانکہ زبان سب کی ایک تھی۔ اِس طرح مسلمانوں کی بہت بڑی طاقت کو منتشر کر دیا گیا۔ شیخ عیسیٰ یوسف نے بتایا کہ مغربی ترکستان کی بربادی کے بعد ترکستانی مسلمانوں نے مشرقی ترکستان کو اپنا مرکز بنا لیا اور کاشغر کو اس کا دارالحکومت قرار دیا۔ چنانچہ ۱۹۳۳ء میں وہاں جمہوریہ اسلامیہ کا قیام عمل میں آیا جس کے صدر الحاج خواجہ نیاز منتخب ہوئے اور وزیرِاعظم الحاج ثابت داملا۔

مگر یکایک ملک کے اندر روسی فوجیں داخل ہوگئیں جو جدید اسلحہ سے لیس تھیں۔ روسی فوجوں نے جمہوریہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ ۵ لاکھ سے زیادہ مسلمانوں کو جیلوں میں ڈال دیا اور ۲ لاکھ تعذیب اور کشت و خون کی نذر ہو گئے۔ دوسری عالمگیر جنگ کے دوران نیشنلسٹ چین (چیانگ کائی شیک کی حکومت) کے مطالبے کی بنا پر ۱۹۴۱ء میں روسی فوجوں نے مشرقی ترکستان خالی کر دیا۔ نیشنلسٹ چین کی فوجوں نے بھی ترکستانی مسلمانوں پر ظلم توڑے۔ بالآخر ترکستانی مجاہد علی خان توره کی قیادت میں ۱۹۴۳ء میں اس حکومت کے خلاف بغاوت برپا ہوگئی مگر روس نے ثالث کی حیثیت سے دخل دیا اور اس کے نتیجے میں یہ طے ہوا کہ ترکستان کو اندرونی خودمختاری دی جائے گی۔ چنانچہ اس کے بعد ۱۹۴۷ء میں عام انتخابات ہوتے جن میں وطن پرست اور مخلص عناصر کو بھاری کامیابی ہوئی۔ ایک نئی حکومت وجود میں آگئی جس میں مسعود صبری گورنر جنرل مقرر کیے گئے۔ محمد امین بغرا وزیر تعمیرات اور شیخ عیسیٰ یوسف الپتگین چیف سکرٹری۔ روس اس حکومت کی پشت پناہی کر رہا تھا مگر ماؤزے تنگ کے لیے یہ صورتِ حال ناقابلِ برداشت تھی۔ چنانچہ ۱۲ اکتوبر ۱۹۴۹ء کو ماؤزے تنگ کی سرخ فوجیں اس ملک میں داخل ہوگئیں۔ ترکستان کے چین نواز بعض فوجی جنرلوں نے اُن سے تعاون کیا اور عوام الناس کی مزاحمت کے باوجود چین کی سرخ فوجوں نے مشرقی ترکستان پر قبضہ کر لیا۔ آخر کار لاتعداد مسلمانوں کو وہاں سے جلاوطن ہونا پڑا۔ کاشغر، یارقند، آقسو، ختن اور طرفان وغیرہ اسلامی تہذیب و ثقافت کے قدیم مراکز آن کی آن میں زمین بوس ہوگئے اور مشرقی ترکستان سے ترک مسلمانوں کی نسبت محو کرنے کے لیے اُس کا نام "مشرقی ترکستان" کے بجائے سنکیانگ رکھ دیا گیا۔ مشرقی ترکستان کا رقبہ ۲۰ لاکھ کیلو میٹر مربع اور آبادی ایک کروڑ ہے۔ یہ تمام کی تمام آبادی مسلمان ہے اور اب کوشش کی جا رہی ہے کہ وہاں چینی اقوام کو لا لا کر آباد کیا جائے۔ مگر ترکستانی آبادی چینیوں سے شدید نفرت کرتی ہے اس لیے بہت کم تعداد میں چینی وہاں جانے پر آمادہ ہوتے ہیں۔ اور جو آباد ہو چکے ہیں اُن کی تعداد چالیس ہزار سے زیادہ نہیں ہے۔ چین نے اس علاقہ میں ایٹمی راکٹوں کی تیاری کے مراکز قائم کر رکھے ہیں۔ یہ ہے روسی اور چینی کمیونسٹوں کا وہ انصاف جو انہوں نے کروڑوں مسلمانوں کے ساتھ کیا ہے۔ اور یہاں کچھ مسخرے یہ سمجھتے ہیں کہ سامراج صرف سفید رنگ ہی کا ہے، سرخ سامراج کہیں موجود نہیں ہے۔

روس کی دوسری مسلم آبادیاں شیخ عیسیٰ یوسف نے دردبھرے انداز میں کہا کہ ہم ترکستان کے دونوں حصوں

کی آزادی چاہتے ہیں۔ یہ عظیم تر ترکستان مسلمانوں کی تاریخی اور تہذیبی دولت کی سرزمین ہے۔ اموی خلیفہ عبدالملک بن مروان کے عہد میں ۸۶ ھ میں یہ علاقے حلقہ بگوش اسلام ہوتے تھے۔ پوری ۱۲ صدیوں تک اس سرزمین نے علم و ثقافت اور جہاد و جانفشانی کے میدان میں زبردست خدمات سرانجام دی ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ مسلمان حکومتیں اس کی اہمیت سے آگاہ نہیں ہو رہی ہیں۔ شیخ عیسیٰ یوسف نے ترکستان کی آزادی کو پاکستان کے بقا و استقلال کے لیے بہت اہم قرار دیا۔ شیخ عیسیٰ نے "عظیم تر ترکستان" کا ایک نقشہ بھی تیار کر رکھا ہے۔ اُسے سامنے رکھتے ہوئے انہوں نے واضح کیا کہ میں صرف ترکستان کی اسلامی حیثیت پر گفتگو کر رہا ہوں۔ ورنہ شمالی آذربیجان (رقبہ: ۹۰ ہزار کیلومیٹر مربع، آبادی ۳۵ لاکھ، مسلم آبادی ۸۰ فیصد)، والگا۔ اُورال کے علاقے (مجموعی رقبہ ۶۰ ہزار کیلومیٹر مربع، آبادی ایک کروڑ ۷۰ لاکھ، مسلمان ایک کروڑ سے زائد)، شمالی قوقاز (رقبہ ایک لاکھ ۶۶ ہزار مربع میل، آبادی ایک کروڑ ۱۰ لاکھ ۲۰ ہزار، اور اکثریت مسلمان) اور جزیرہ نمائے قرم یا کریمیا (رقبہ ۲۷ ہزار کیلومیٹر مربع۔ مسلم آبادی ۲۲ لاکھ جو ۱۹۴۶ء میں پوری کی پوری جزیرہ سے نکال دی گئی) اور جمہوریہ تاتار اور جمہوریہ باشکر جن میں لاکھوں تاتاری مسلمان رہتے ہیں، مسلم علاقے ہیں اور یہ بھی اُسی ہمدردی، توجہ اور تعاون کے مستحق ہیں جس کے مستحق ترکستانی مسلمان ہیں۔

شیخ عیسیٰ یوسف نے اپنے حیرت انگیز حافظے کی مدد پر مجھے رُوس اور چین کے مسلمانوں کی کتاب ماضی کے ورق ورق سُنا دیئے، پھر انہوں نے نہایت مستند تحریری مواد بھی میرے سامنے رکھ دیا اور تاکید کی کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی سے درخواست کی جائے کہ وہ ہمارے مسئلہ کو اُٹھائیں۔ شیخ عیسیٰ یوسف مسکراتے ہوئے کہنے لگے کہ مولانا مودودی کا اپنا خاندان بھی تو اصلاً ماوراء النہر کا ہے اور ننہیال کی طرف سے وہ خود بھی ترکستانی ہیں اس لیے یہ اُن کا اسلامی مسئلہ بھی ہے اور وطنی اور ملّی بھی۔ مولانا محترم کا خاندانی لحاظ سے ترکستانی اور مادری سلسلے سے تُرک یا ترکمان ہونا ترکستانی مہاجروں میں خوب مشہور ہے۔ ترکی کے لوگ بھی جب یہ سُنتے ہیں تو بہت خوش ہوتے ہیں۔ بہر حال شیخ عیسیٰ یوسف الپتگین کے ساتھ ۲ گھنٹے تک بات چیت ہوتی رہی، اور اُن کی جگر پاش پاش کر دینے والی کہانی سُنتا رہا۔

ترکستانی مہاجروں کی تنظیم | شیخ عیسیٰ یوسف اور دوسرے ترکستانی مہاجروں نے استنبول میں باقاعدہ

اپنی ایک تنظیم قائم کر رکھی ہے۔ اس تنظیم کا ایک اعلیٰ قسم کا مرکز ہے جو استنبول میں شارع باب علی قادسی پر ایک خوبصورت اور بلند و بالا عمارت میں واقع ہے۔ اس مرکز میں ترکستانی تنظیم نے اچھے سرگرم، انتھک اور قابل نوجوانوں کی ٹیم جمع کر رکھی ہے جو ہمہ وقت اپنے مشن میں منہمک رہتی ہے۔ اور خوشی کی بات یہ ہے کہ ان نوجوانوں کے اندر ایسے افراد بھی ہیں جو ترکی کے علاوہ روسی، انگریزی اور عربی زبانوں میں بھی دسترس رکھتے ہیں۔ شیخ عیسیٰ نے ایک نوجوان عرفان اوغلو کا نام لیا اور مجھے تاکید کی کہ میں اُس سے ضرور ملوں۔ وہ عربی زبان میں بہت اچھی مہارت رکھتے ہیں۔ شیخ عیسیٰ نے ترکستان کے مسئلہ پر مجھے جو تحریری مواد دیا اُس میں اکثر چیزیں اسی نوجوان کی تیار کردہ ہیں۔ علاوہ بریں اس دفتر کے اندر وہ پورا دستاویزی مواد موجود ہے جو ترکستان کی تاریخ اور وہاں کی مسلم آبادی کے حالات اور چینی کمیونسٹوں کے مظالم کی منہ بولتی تصویر پیش کرتا ہے۔ قدیم لٹریچر موجود ہے، خود روس اور چین کے اخبارات اور کتابوں کے حوالے موجود ہیں، نقشے اور خاکے ہیں الغرض علمی اور سیاسی جنگ لڑنے کے لیے جس مواد کی ضرورت ہے وہ انہوں نے مہیا کر رکھا ہے۔ شیخ عیسیٰ یوسف کہنے لگے کہ مولانا مودودی ہمیشہ یہ تاکید کرتے رہے ہیں کہ ہم اپنی ایک باقاعدہ تنظیم قائم کریں اور دنیا کی مختلف زبانوں میں ترکستان کے مسئلہ کو عالمی رائے عام اور خصوصاً عالم اسلامی کے سامنے رکھیں۔ ہماری موجودہ تنظیم کی سرگرمیاں مولانا محترم کی اسی حوصلہ افزائی کا نتیجہ ہیں۔ ترکستان کے بعض دوسرے مہاجرین بھی انفرادی طور پر ترکستان کے مسئلہ پر آواز اٹھاتے رہتے ہیں۔ ان میں نمایاں ترین آدمی شیخ محمد امین اسلامی ہیں جو جدہ میں مقیم ہیں اور قلمی حد تک اس مسئلہ کے حق میں بھرپور جدوجہد کر رہے ہیں۔ اس معاملے میں مغربی ترکستان کے مہاجرین نے کمزوری کا ثبوت دیا ہے۔ ترکی، افغانستان، پاکستان اور سعودی عرب میں ان کے بکثرت لوگ بستے ہیں۔ مگر ایک تو روسی کمیونسٹوں کے وحشیانہ مظالم کا ہول ان پر اس قدر طاری رہا کہ اطمینان اور دلجمعی کے ساتھ ان کو اپنے قضیے کو پیش کرنے کا کہیں موقع نہ مل سکا اور دوسرا غریب الوطنی اور معاشی مشکلات بھی ان کی راہ میں حائل رہیں۔ مگر اب بظاہر ان کے لیے کوئی عذر باقی نہیں رہا ہے۔ انہیں اپنے مسئلہ کو بانگ دہل اٹھانا چاہیے۔ شیخ عیسیٰ سے یہ معلوم کر کے اطمینان ہوا کہ جزیرہ نمائے قرم (کریمیا) کے تاتاری مہاجروں میں سرگرمی پائی جاتی ہے۔ ترکی میں ان کی اپنی تنظیم ہے جس کی طرف سے امل کے نام سے ایک اخبار نکلتا ہے اور

اب خود روس میں بھی انہوں نے ایجی ٹیشن شروع کر دیا ہے۔ راقم الحروف نے شیخ عیسیٰ یوسف سے وعدہ کیا کہ ہم نے ترکستان کے مسئلہ کے بارے میں پہلے بھی کبھی کوتاہی نہیں کی ہے، مگر آئندہ انشاءاللہ اس میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کریں گے۔ بلکہ میں نے انہیں یاد دلایا کہ ایک مرتبہ رابطۂ عالم اسلامی کے اجلاس میں ترکستان کے مسئلہ پر جب قرارداد آئی تو فارموسا کے نمائندے کی طرف سے اُس کی مخالفت کی گئی، کیونکہ روس اور چین کے علاوہ فارموسا کی نیشنلسٹ حکومت بھی ترکستان کی دعویدار ہے اور تاریخی طور پر وہ ترکستان کو چین ہی کا ایک حصہ قرار دیتی ہے۔ مگر مولانا مودودی نے اس کوشش کا بروقت تدارک کیا اور تاریخی حیثیت سے تحریری طور پر رابطہ کے اجلاس کے اندر یہ ثابت کیا کہ ترکستان صرف ترکستان کی تُرک اور مسلمان اقوام کا خطہ ہے اور بیرونی اقوام کو خواہ وہ چینی ہوں یا رُوسی اس پر قبضہ کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ چنانچہ مولانا محترم کے دلائل کے بعد ترکستان کے مسئلہ پر بڑی مضبوط اور واضح قرارداد پاس کی گئی اور آئندہ کے لیے ایسی نامناسب اور بے بنیاد کوشش کا سدِّباب کر دیا گیا۔

ایک اسلامی ورکشاپ شیخ عیسیٰ یوسف سے فارغ ہوا تھا کہ عبدالقادر سیزگین، نائف آفندی اور استاذ عُزیر اور شیخ یوسف بھی تشریف لے آئے اور استنبول کے بعض مقامات کی سیر کے ارادے سے ہم ہوٹل سے نکل کھڑے ہوئے۔ قدیم استنبول (قسطنطنیہ) کی حد سے نکل کر جو قدیم فصیل کی شکل میں اب تک قائم ہے نئی آبادی میں آگئے۔ پروگرام تو یہ تھا کہ سب سے پہلے حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے مزارِ مبارک پر حاضری دی جاتے۔ مگر چونکہ نماز ظہر کا وقت ہو رہا تھا اس لیے ہم راستے میں ایک ورکشاپ میں چلے گئے جس کے مالک جناب حسین آفندی بڑے نیک دل اور صاحب جذبہ مسلمان ہیں۔ اس ورکشاپ میں ہم نے نماز ظہر ادا کی۔ ورکشاپ کے مالک اور نوخیز کاریگروں کو دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی۔ اس ورکشاپ میں نجاری کے آلات تیار ہوتے ہیں اور ۴۰ کے قریب کاریگر کام کر رہے ہیں جو سب کے سب نوخیز اور ۲۰-۲۵ سال کے لگ بھگ یا اس سے کم عمر کے ہیں۔ نماز ظہر کے وقت ورکشاپ بند کر دی گئی اور خود حسین آفندی اور تمام ملازمین ورکشاپ کی مسجد میں، جو ورکشاپ کے اوپر کے حصہ میں بنائی گئی ہے، جمع ہو گئے۔ عبدالقادر سیزگین نے جماعت کرائی۔ اس کے بعد نوخیز نمازیوں نے قرآن پاک کی تلاوت شروع کر دی۔ تقریباً سات آٹھ لڑکوں

نے تلاوت میں حصّہ لیا۔ اور یہ دیکھ کر تعجّب ہُوا کہ ابھی ابھی جو لڑکے بجلی کی مشینوں پر کام کر رہے تھے اور آپس کے ساتھ کُشتی لڑ رہے تھے وہ جب قرآن کی تلاوت کرنے لگے تو لہجہ، مخارج اور ادائیگی الفاظ میں اچھے خاصے قاری نظر آتے۔ آواز کا سُریلا پن اِس پر مستزاد۔ کجا ورکشاپوں کی دنیا اور کجا نماز اور قرآن سے یہ دلچسپی۔ قراءت کے بعد مجھ سے تقریر کا مطالبہ کیا گیا۔ چنانچہ میں نے مختصر طور پر اُن کے سامنے اسلام میں محنت کی اہمیت اور محنت کار کے مرتبہ و مقام پر اظہارِ خیال کیا۔

اِس نرالی ورکشاپ سے مجھے بڑی دلچسپی پیدا ہو گئی۔ حسین آفندی سے جب گفتگو ہوئی تو انہوں نے بتایا کہ مَیں یہاں ننھے بچّوں کو اِس شرط پر بھرتی کرتا ہوں کہ وہ نماز پڑھیں گے اور اُن اسلامی آداب کا جن کی اس ورکشاپ میں پابندی کرائی جاتی ہے، لحاظ کریں گے اور قرآن کریم کی سورتیں اور دعائیں یاد کریں گے۔ چنانچہ میں نماز اور قرآن خوانی کے لیے انہیں ورکشاپ کے اوقاتِ کار میں موقع دیتا ہوں۔ نماز اور روزہ کے مسائل بھی انہیں باقاعدہ پڑھائے جاتے ہیں۔ رمضان شریف میں اوقاتِ کار میں بھی دو گھنٹوں کی کمی کر دی جاتی ہے۔ حسین آفندی نے مسجد کے اندر وضو کے لیے گرم پانی کا وافر انتظام کر رکھا ہے۔ لڑکوں کو ایک ایک آہنی الماری دے رکھی ہے جس میں وہ اپنے کپڑے اور صابن رکھتے ہیں اور نماز پڑھنے کے وقت فوراً لباس تبدیل کر لیتے ہیں۔ میں نے چند لڑکوں سے پوچھا کہ وہ روزے کی حالت میں کیسے کام کر رہے ہیں؟ اُن سب کا جواب یہ تھا کہ روزہ کام میں ہرگز حائل نہیں ہوتا بلکہ روزے میں انسان زیادہ یکسوئی کے ساتھ کام کرتا ہے۔ ایک نوجوان نے یہاں تک کہہ دیا کہ یورپ نے لوگوں کو دھوکا دیا ہے کہ روزہ سے کارخانوں کی پیداوار میں کمی ہو جاتی ہے۔ اس ذہین و فطین نوجوان نے میری معلومات میں یہ اضافہ بھی کر دیا کہ یورپ نے جو کچھ کہا ہے یہ اُس کے اپنے ذہن کی اختراع نہیں ہے بلکہ ایک یہودی اسکالر ڈوریتج نے سب سے پہلے کہا تھا کہ "رمضان کا مہینہ پیداوار میں حائل ہوتا ہے" معلوم ہُوا کہ اس کارخانے کے تمام کارکن روزے سے ہیں۔ اُن سب نے حسین آفندی سے بڑی محبت کا اظہار کیا اور اُن کی خوش اخلاقی کی بے حد تعریف کی۔ اُجرتوں کے بارے میں بھی حسین آفندی بڑی فراخدلی اور انصاف پسندی کا ثبوت دیتے ہیں۔ دو سو ترکی پونڈ سے اُجرت کا آغاز ہوتا ہے جو معمولی کام جاننے والا لیتا ہے اور پھر حسب قابلیت اور تجربہ اُس میں ترقی ہوتی جاتی ہے۔ حسین آفندی سے

گفتگو میں یہ انکشاف بھی ہوا کہ ان کا تعلق ترکی کی اسلامی تحریک سے ہے۔ بڑے مجاہد اور سرگرم آدمی ہیں دین کی دعوت و اشاعت میں نمایاں حصہ لیتے ہیں۔ ان کی ورکشاپ میں جتنے لڑکے کام کرتے ہیں ان کے والدین اور سرپرستوں پر ان کا بڑا اخلاقی اثر ہے۔ ورکشاپ سے رخصت ہونے لگے تو حسین آفندی نے کہا کہ پاکستان میں جو لوگ اسلام کی سربلندی کے لیے کام کر رہے ہیں اُن سب تک میرا ہدیۂ محبت و عقیدت پہنچا دیا جائے۔ حسین آفندی نے ورکشاپ کو صحیح معنی میں اسلامی تحریک کا نرسری فارم بنا رکھا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تحریک ہمہ پہلو کام کر رہی ہے اور نیک فطرت انسانوں کی ایک جماعت اللہ تعالیٰ نے اس کام پر لگا رکھی ہے۔

قبرستان سلطان ایوب ورکشاپ سے فارغ ہو کر ہم اس آبادی میں آ گئے جسے "ایوب سلطانؒ" کہتے ہیں۔ حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ اور چند دیگر صحابہ کی اسی آبادی میں آرامگاہیں ہیں۔ یہ آبادی حضرت ابو ایوب انصاریؓ کے نام منسوب ہے اور عوام اسے احتراماً "ایوب سلطانؒ" کہتے ہیں۔ یہ نہایت پُرفضا اور دلکش مقام ہے ایک پہاڑی کے اُوپر ہم نے چڑھ کر دیکھا کہ گولڈن ہارن خلیج پانچ میل تک اندر داخل ہونے کے بعد یہاں آ کر ختم ہو رہی ہے۔ ساحل کے اِس پار وسیع و عریض قبرستان ہے۔ اور اس کا نام بھی "ایوبیہ" ہے۔ دُور دُور تک قبریں نظر آئیں۔ عثمانی خاندان کے کئی بزرگ اس قبرستان میں مدفون ہیں۔ نائف آفندی نے کئی ترکی جرنیلوں اور سپہ سالاروں کے نام بھی لیے جن کی قبریں یہاں بنی ہوئی ہیں۔ گزشتہ زمانے میں بھی اور آج بھی ہر شخص کی یہ آرزو ہے کہ اُس کی آخری آرامگاہ اِسی متبرک قبرستان کے کسی گوشے میں بنے۔ اور اُسے حضرت ابو ایوب انصاری کی ہمسائگی اور قُرب کی سعادت حاصل ہو۔ قریب ہی ایک قبر کی طرف انگلی کا اشارہ کرتے ہوئے نائف آفندی نے کہا یہ فوزی چقماق پاشا کی قبر ہے۔ اُستاذ عزیر نے فوراً چین بجبیں ہو کر کہا کہ "ترکی کو لادینیت کے حوالے کرنے میں ان صاحب کا بھی حصہ ہے کیونکہ فوزی چقماق پاشا کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ لوزان کانفرنس (۱۹۲۳ء) کے بعد مصطفیٰ کمال پاشا نے پچھلے تمام وعدوں پر پانی پھیر کر نیا راستہ اختیار کر لیا ہے۔ یہ معلوم ہو جانے کے بعد فوزی چقماق نے کیوں نہ اس سے عوام کو خبردار کیا؟ اور کیوں نہ لادینیت کے سیلاب کا بروقت انسداد کیا؟ مصطفیٰ کمال پاشا اور مخترم عصمت انونو کے دَور تک ترک عوام اپنی تاریخ کے ۲۵ سالہ دَور کے بارے میں اندھیرے میں رہتے ہیں مگر اب جو اس دَور کے چہرے سے یکایک نقاب اٹھا ہے تو اس کا ہر پہلو روز روشن کی

طرح عیاں ہو کر سامنے آگیا ہے۔ اِس دور میں جس شخص نے جو رول ادا کیا ہے ترکی قوم کا بچہ بچہ اُس سے آگاہ ہو چکا ہے اور مدح و ستائش کے جھوٹے اور مصنوعی لبادے اُتر جانے کے بعد تاریخ کے صفحات میں وہی مقام حاصل کر رہا ہے جس کا وہ مستحق ہے۔ آج ایک مختصر سے بے دین گروہ کے سوا ترک عوام میں ایک شخص بھی ایسا نہیں ملے گا جو مصطفیٰ کمال کو ترکی قوم کا ہیرو سمجھتا ہو۔ بلکہ جس سے بات کیجیے وہ اس کو بد ترین الفاظ سے یاد کرتا ہے۔

پیرلوتی کا قہوہ خانہ | پہاڑی کی چوٹی پر ایک قدیم قہوہ خانہ ہے جسے "پیرلوتی کا قہوہ خانہ" کہتے ہیں۔ پیرلوتی مشہور فرانسیسی ناول نگار گزرا ہے۔ یہاں یہ روایت مشہور ہے کہ اس نے اپنا شہرۂ آفاق ناول ازیادا اسی قہوہ خانہ کے اندر ایک چٹان کے اوپر بیٹھ کر لکھا ہے۔ اس ناول میں اُس نے جتنی خیالی تصویریں کھینچی ہیں وہ اس منظر کے حسن و جمال سے تأثر کا نتیجہ تھیں۔ قہوہ خانہ کے اندر کی ہر چیز حتیٰ کہ فرنیچر، برتن اور اشیاء کی ترتیب قدیم عثمانی دور کی عکاسی کرتی ہے۔ عثمانی خلفاء بھی غم دنیا سے تھوڑی دیر نجات پانے کے لیے اس قہوہ خانہ کی طرف رجوع کرتے رہے ہیں۔ اگر عثمانی دور کی مثالی تفریح گاہ کا اندازہ کرنا ہو تو اس قہوہ خانہ سے اُس کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ہر چیز سے معقولیت اور سنجیدگی مترشح ہوتی ہے۔ ساقی گروں کے لباس بھی جو نمونے اس میں نظر آتے ہیں اُن سے بھی یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ اُس دور میں تفریح اور دل لگی کے لیے جو سامان اور ذرائع مستعمل تھے اُن میں جائز حدود کو پامال نہیں کیا گیا اور نہ سنجیدگی اور وقار کا دامن ہاتھ سے چھوڑا گیا ہے۔ البتہ قہوہ خانہ کے موجودہ کارندے اِس سنجیدگی اور وقار کو ٹھیس پہنچا رہے ہیں۔ ہم اندر داخل ہوئے تو ایک خاتون جس نے قدیم طرز کا خالص ترکی لباس پہن رکھا تھا ہمیں قہوہ پیش کرنے کے لیے آگے بڑھی مگر نائف آفندی نے اُسے تُرش لہجے میں کہا کہ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ یہ رمضان المبارک کا مہینہ ہے؟ اس پر اُس نے بڑی معذرت کی اور معافی بھی مانگی اور بتانے لگی کہ عام سیاح آکر یہاں آج کل بھی قہوہ پیتے ہیں۔ اس لیے مَیں نے معمولاً یہ پیش کش کر دی۔ اِس رومانی شہر میں یہ جگہ صد درجہ رومانی ہے۔ زائر اس منظر پر نگاہ ڈالتے ہی بیخود ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ قدیم استنبول کے گنبد اور مینار، ہلال نما شاخ زریں، وہ چھوٹا سا چشمہ جس کا نام یورپ کا آبِ شیریں رکھا گیا ہے جہاں ترک شہزادیاں پکنک کے لیے جایا کرتی تھیں، اور تاحدِ نگاہ لالہ و نسترن کی بچھی ہوئی سُرخ و زرد چادر۔

قبروں سے مسلمانوں کی عقیدت | حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے مزارِ مبارک کو جب ہم جا رہے تھے۔ تو راستے میں بعض ایسی قبریں نظر آئیں جن پر شمعیں جل رہی تھیں اور دیواروں کے ساتھ دھاگے بندھے تھے۔ میں نے نائف آفندی سے پوچھا کہ یہ حرکتیں ترکی میں بھی ہوتی ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ یہاں کئی ولیوں کے مزار ہیں جن میں ہر وقت اہلِ طلب کا ہجوم رہتا ہے۔ عورتیں اور مرد اپنی حاجتیں لے کر آتے ہیں شمعیں جلاتے ہیں۔ نذرانے چڑھاتے ہیں اور حصولِ مدعا کے لیے دیواروں پر دھاگے باندھتے ہیں۔ اندازہ کیجیے کہ قبر پرستی اور خوش عقیدگی کی یہ وبا مسلمان ملکوں میں کس قدر عام ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کے جہال ہی اس میں مبتلا نہیں ہیں، یورپی ترکی کے جہال بھی اِس حمام میں ننگے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ ۱۹۶۴ء میں جب میں قاہرہ گیا اور امام شافعیؒ کی قبر پر فاتحہ خوانی کے لیے حاضر ہوا تو یہ دیکھ کر طبیعت سخت کبیدہ ہوئی کہ ایک امام اور فقیہ کی قبر کو بھی یار لوگوں نے اپنی اوہام پرستی کی آماجگاہ بنا رکھا ہے۔ عورتوں کے گروہ قبر کے گرد طواف کر رہے ہیں۔ طواف کے دوران عورتیں جھومتی ہیں اور چیخیں مارتی ہیں۔ مجاوروں کی بن آئی ہے۔ نذرانے اور ہدیوں کی بھرمار ہے۔ عورتوں کی چیخوں کی حقیقت ایک دوست نے یہ بتائی کہ یہ امام شافعیؒ کی رُوح سے ہمکلام ہونے کے لیے ہیں۔ کتاب الاُمّ اور الرسالہ کے مصنّف اور اصولِ فقہ کی بنیاد رکھنے والے اور مذہب شافعیؒ کے امام کو کیا خبر تھی کہ انہیں پیروکاروں کی ایک ایسی جماعت بھی ملے گی جسے اُن کی فقہ سے کوئی دلچسپی نہ ہوگی بلکہ وہ اُن کی رُوح کو حاضر کرکے اُس سے عشق و محبت کی مشکلات حل کرنے میں مدد حاصل کرے گی۔ خرافات بدعات کی یلغار سے اگر کسی کی قبر محفوظ رہی ہے تو وہ امام ابن تیمیہؒ ہیں۔ دمشق میں جہاں ابن العربی کا مزار اوہام پرستی اور مشرکانہ اعمال کا گڑھ بنا ہوا ہے، امام ابن تیمیہؒ اسپتال کی ایک غیر آباد دیوار کے زیرِ سایہ اِن تمام حرکتوں سے محفوظ ابدی نیند سو رہے ہیں۔ اور گمنامی کا یہ عالم ہے کہ اگر کسی سے اُن کی قبر پوچھی جائے تو وہ لاعلمی کا اظہار کرے گا

(باقی)

انسانی جان اور جسم کے خلاف جرائم کی سزا

اسلامی قانون میں

ڈاکٹر عبدالعزیز عامر

(۹)

سر اور چہرے کے زخموں میں قصاص | فقہاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ مُوضحہ (د) میں قصاص ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ "اور تمام زخموں میں بدلہ ہے" ظاہر ہے کہ مُوضحہ بھی ایک زخم ہی ہے، نیز اس لیے بھی کہ اس زخم کے لیے ایک متعین حد ہے جس سے وہ متجاوز نہیں ہو سکتا، اور برابر کا بدلہ لینا ممکن ہے۔ کیونکہ قصاص میں استعمال ہونے والا آلہ متعین حد پر یعنی ہڈی پر جا کر رک سکتا ہے[1]۔ مُوضحہ کے بعد کی جو اقسام ہیں ان کے بارے میں بھی فقہاء کے درمیان کامل اتفاق ہے کہ ان میں قصاص نہیں ہے کیونکہ ان سب میں ہڈی ٹوٹ جاتی ہے اور ہڈیوں میں قصاص جاری نہیں ہوتا، کیونکہ جرم کے برابر بدلہ نہیں لیا جا سکتا۔ ہاشمہ میں ہڈی ٹوٹ جاتی ہے، منقلہ میں ٹوٹنے کے بعد ہڈی اپنی جگہ سے ہٹ جاتی ہے۔ آمہ میں اگر قصاص جاری کیا جائے تو اس بات کا خطرہ رہتا ہے کہ زخم دماغ تک پہنچ جائے اور مجرم کی جان ہی چلی جائے، یا اس کے جرم سے اُسے زیادہ سزا مل جائے، اور دامغہ کا بھی یہی حکم ہے[2]۔

---

[1] شجۃ اور اس کے مفہوم پر تفصیلی بحث کے لیے دیکھیے: تبیین الحقائق شرح الکنز، زیلعی، ج ۶ ص ۱۳۲۔ نہایۃ المحتاج الی شرح المنہاج، ج ۷ ص ۲۹، ۳۰۔ الاحکام السلطانیہ، ابو یعلیٰ، ص ۲۶۱، ۲۶۲۔ الشرح الکبیر ج ۹ ص ۶۱۹۔ التاج والاکلیل لمختصر خلیل، ج ۶ ص ۲۴۶، ۲۴۷، یہ کتاب مواہب الجلیل شرح مختصر خلیل کے حاشیہ پر مطبوع ہے۔ حاشیۃ الدسوقی علی شرح الدردیر، ج ۴ ص ۲۹۳ اور اس کے بعد۔

[2] تبیین الحقائق شرح الکنز، زیلعی، ج ۶ ص ۱۳۳۔ التاج والاکلیل لمختصر خلیل، ج ۶ ص ۲۴۶ و ۲۴۷۔

مُوضحہ سے پہلے کے جو زخم اوپر ذکر ہوئے ہیں، ان کے بارے میں فقہاء کے درمیان اختلاف رائے ہے۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ ان سب میں قصاص ہے، کیونکہ ان زخموں میں جُرم کے برابر سزا دی جا سکتی ہے[1]۔

حسنؒ کی روایت کے مطابق امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ مُوضحہ میں قصاص واجب ہے اور اگر سمحاق میں قصاص کا اجراء ممکن ہو تو اس میں بھی واجب ہے[2]۔ ظاہر روایت میں ہے کہ مُوضحہ سے کم درجے کے زخموں میں قصاص واجب ہے، کیونکہ ان میں مساوی بدلہ لیا جا سکتا ہے[3]۔

امام شافعیؒ اور امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ مُوضحہ سے پہلے بیان کردہ زخموں میں قصاص نہیں ہے، کیونکہ یہ زخم ہڈی تک نہیں پہنچتے، لہٰذا ان کی کوئی متعین حد نہیں ہے، جہاں تک قصاص لیا جا سکے اور کسی ظلم و تعدی کا کوئی ڈر نہ ہو۔ باقی یہ کہ اگر زخم کو طول و عرض کے لحاظ سے ماپا جا سکتا ہے تو محض اس بات کا امکان ظلم و زیادتی کے خطرے کو دور نہیں کر دیتا۔ عین ممکن ہے کہ باضعہ اور سمحاق کے بدلے میں آنے والا زخم موضحہ ہو جائے۔

ہ۔ یہ مواہب الجلیل کے حاشیے پر چھپی ہوئی ہے، لکھتے ہیں: "سر اور چہرے کے زخموں میں موضحہ کے بعد قصاص نہیں ہے اگرچہ منقلہ کے قصاص کے بارے میں اختلاف رائے منقول ہے۔ مشہور یہ ہے کہ امام مالکؒ کے نزدیک ہڈی میں قصاص ممکن ہے الا یہ کہ خطرہ زیادہ ہو"۔ المہذب، شیرازی، ج ۲، ص ۱۹۰ — نیز دیکھیے، المحلّی، ابن حزم، ج ۱۰، ص ۴۶۱، اس میں لکھتے ہیں: "بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ بالارادہ زخمی کرنے کی صورت میں مُوضحہ کے سوا دوسری اقسام میں قصاص نہیں ہے، ان لوگوں کا کہنا ہے کہ ان زخموں میں برابری کا بدلہ لینا ممکن نہیں ہے۔ بعض دوسرے حضرات یہ کہتے ہیں کہ سب میں قصاص کا اجراء ہوگا کیونکہ برابر کا بدلہ لینا ممکن ہے جیسا کہ اللہ کا حکم ہے۔" اس کے بعد ابن حزم یہ کہتا ہے کہ صحیح قول یہ ہے کہ سب میں قصاص ہے کیونکہ آیت وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ "تمام زخموں میں قصاص ہے" اور وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ "حرمتوں میں معاوضہ ہے۔ سو جو تم پر زیادتی کرے تم بھی اس پر زیادتی کرو، جیسی اس نے تم پر زیادتی کی"۔ (۲: ۱۹۴) کتاب اللہ میں یہ حکم عام ہے اور زخموں میں سے کسی ایک کی کوئی تخصیص وارد نہیں ہے۔

[1] التاج والاکلیل لمختصر خلیل، ج ۶، ص ۲۴۶ — حاشیۃ الدسوقی علی شرح الدردیر، ج ۴، ص ۲۹۲۔

[2] البدائع الکاسانی، ج ۷، ص ۳۰۹۔ [3] تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق، زیلعی، ج ۶، ص ۱۳۳، [illegible]

یا فقط سمحاق کے بدلے ایسا زخم لگایا جائے جو مُوضحہ کی تعریف میں آجاتے۔ کیونکہ اس بات کا امکان ہے کہ شخص متضرر کا گوشت اس قدر زیادہ اور گہرا ہو کہ اس کے باضعہ زخم کے بدلے مجرم کا زخم موضحہ یا سمحاق بن جائے[۱]۔

مُوضحہ کے بعد جن زخموں کا تذکرہ ہُوا ہے، ان کے بارے میں اگرچہ ان کی رائے بھی وہی ہے جو دوسرے علماء کی ہے کہ ان میں قصاص واجب نہیں ہے کیونکہ ان میں مجرم سے پُورا پُورا بدلہ لینا ممکن نہیں ہے، لیکن ان میں مجرم سے پُورا پُورا بدلہ لینا ممکن نہیں ہے۔ لیکن وہ اس کے قائل ہیں کہ متضرر کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ ان زخموں کے بدلہ مجرم سے صرف موضحہ کا قصاص لے۔ کیونکہ بعد میں ذکر ہونے والے زخم موضحہ سے زیادہ ہوتے ہیں اور جب اس نے اس کے بدلے موضحہ کا قصاص لے لیا تو گویا اُس نے اپنے حق کا ایک حصہ لے لیا۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ قصاص میں مُوضحہ کا قصاص لینے کے بعد متضرر کو یہ حق بھی پہنچتا ہے کہ موضحہ کے معاوضے اور اس سے بعد میں ذکر ہونے والے بڑے زخم کے معاوضے میں جو فرق ہو گا وہ بھی وصُول کرلے۔ کیونکہ مجرم کو جو مضرت پہنچی، اس میں موضحہ سے زیادہ حصے میں قصاص کا اجراء ممکن نہیں تھا، لہٰذا اصولاً مجرم

۴- " ظاہر روایت میں یہ ہے کہ موضحہ سے کم درجے کے زخموں میں قصاص ہے، محمدؒ نے اصل میں یہی لکھا ہے اور یہی صحیح تر ہے کیونکہ اس میں مساوی بدلہ لیا جاسکتا ہے۔"

[۱] المہذب ج ۲ ص ۱۹۰ — نہایۃ المحتاج الی شرح المنہاج ج ۷ ص ۳۰ لکھتے ہیں " صرف موضحہ میں قصاص واجب ہے کیونکہ اس کی صورت متعین ہے اور اس کے برابر کا بدلہ لیا جاسکتا ہے۔ لیکن اس کے علاوہ دوسرے زخموں کی یہ صورت نہیں ہے۔ بعض لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ موضحہ اور اس سے قبل کے زخموں میں قصاص واجب ہے کیونکہ ان کی مقدار موضحہ کی نسبت سے متعین ہو سکتی ہے۔ لیکن اس رائے کی تردید میں یہ کہا گیا ہے کہ صرف یہ امکان وجوب قصاص کے لیے کافی نہیں ہے۔ اس سے تو صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ مُوضحہ میں جو تاوان ہے، ان زخموں میں اسی نسبت سے تاوان واجب ہو گا۔ موضحہ سے قبل کے جو زخم ہیں ان میں سے حارصہ میں تاوان بھی واجب نہیں کیونکہ حارصہ کی وجہ سے متضرر کی کوئی ایسی چیز ضائع نہیں ہوتی جو پہلے تھی۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو گا کہ حارصہ میں قصاص بھی واجب نہیں۔ نیز موضحہ سے کم درجے کے زخموں میں بھی حارصہ کے ماسوا قصاص واجب نہیں اگرچہ ایک قول کے مطابق ان میں قصاص ہے۔ — کشاف القناع عن متن الاقناع، ج ۳ ص ۳۸۵، ۳۸۶ — الشرح الکبیر ج ۹ ص ۴۱۶ اور اس کے بعد۔

اس کے بدلے میں معاوضہ لینے کا حقدار ہونا چاہیے

موضحہ سے زیادہ حصے کے بارے میں جس میں قصاص کا اجراء ممکن نہ ہو، بعض حنبلی فقہاء نے بھی امام شافعیؒ کی رائے اختیار کی ہے۔ لیکن بعض دوسروں کا کہنا یہ ہے کہ اس صورت میں متضرر کسی مزید معاوضہ کا مستحق نہیں ہے۔ کیونکہ اس صورت میں ایک ہی عضو میں قصاص اور معاوضہ (DAMAGES) دونوں سزائیں جمع ہو جائیں گی جو اصولاً صحیح نہیں ہے[1]

سر اور چہرے کے زخموں میں تاوان

اگر کسی عمدی جرم میں قصاص ممکن نہ ہو، یا جرم بطور خطاء سرزد ہو گیا ہو تو اس میں تاوان واجب ہوتا ہے[2]۔ یہ تاوان کبھی مقرر رہتا ہے اور کبھی غیر مقرر۔

اس بات پر علماء کا اتفاق ہے کہ موضحہ سے پہلے ذکر کردہ جراحات میں کوئی مقرر معاوضہ نہیں ہے[3]۔ امام

[1] المہذب، شیرازی، ج ۲، ص ۱۹۰۔ الشرح الکبیر، ج ۹ ص ۶۱۹۔

[2] الکاسانی، ج ۷، ص ۳۲۲۔

[3] تبیین الحقائق شرح الکنز، زیلعی، ج ۶، ص ۱۳۳۔ لکھتے ہیں "حارصہ، دامعہ، دامیہ، باضعہ، متلاحمہ اور سمحاق میں منصفانہ تاوان ہے"، کیونکہ ان میں کوئی مقررہ تاوان نہیں ہے اور یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ ان زخموں کو بغیر کسی معاوضے کے لغو قرار دیا جائے۔ ابراہیم نخعیؒ اور عمر بن عبدالعزیزؒ کی یہی رائے ہے"۔ —— البدائع، الکاسانی ج ۷، ص ۳۲۴ —— الشرح الکبیر ج ۹ ص ۶۱۹ —— المہذب، الشیرازی، ج ۲ ص ۲۱۳، ۲۱۴۔ لکھتے ہیں: "موضحہ سے پہلے سر اور چہرے کے ۵ زخم ہوتے ہیں۔ حارصہ دامیہ، باضعہ، متلاحمہ اور سمحاق۔ ان زخموں کا حکم یہ ہے کہ ان کی پیمائش موضحہ کے ساتھ کی جائے گی۔ مثلاً صورت یہ ہو کہ سر میں ایک موضحہ زخم ہو۔ اس کے ساتھ ہی دوسرے شخص کی ضربات سے باضعہ یا متلاحمہ زخم آجائے اب اگر اس کی پیمائش موضحہ کے مطابق ہو سکتی ہے اور وہ موضحہ کا ½ یا ⅓ یا ¼ بنتا ہے تو موضحہ کے معاوضے کا اسی قدر حصہ اس میں واجب ہو گا۔ کیونکہ اس صورت میں مضرت کے تاوان کا اندازہ بذات خود ہو جاتا ہے لہذا کسی دوسرے پیمانے سے ناپنے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن اگر یہ زخم موضحہ سے کوئی نسبت نہیں رکھتا تو پھر اس میں منصفانہ تاوان واجب ہو گا۔ کیونکہ تاوان کی مقدار مقرر کرنا شریعت کا کام ہے اور چونکہ شریعت نے موضحہ سے کم درجے کے زخموں کے لیے معاوضہ نہیں مقرر کیا اور اسے موضحہ سے کوئی قدر و نسبت بھی نہیں ہے۔ لہذا اس میں منصفانہ معاوضہ ہی واجب ہو گا

احمد سے ایک روایت ہے کہ دامیہ میں ایک اونٹ باضعہ میں دو، متلاحمہ میں تین اور سمحاق میں چار اونٹ واجب ہیں۔ اس روایت پر دلیل یہ دی گئی ہے کہ حضرت زید بن ثابت اس کے قائل تھے۔ لیکن یہ رائے مذہب حنبلی کی مقبول رائے نہیں ہے[1]۔

موضحہ اور اس کے بعد مذکورہ زخموں میں مقررہ تاوان ہیں جن کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ جمہور فقہاء کی رائے کے مطابق موضحہ کا مقرر تاوان ۵ اونٹ ہیں۔ خواہ وہ سر میں ہو یا چہرے پر[2]۔ لیکن فقہاء کی ایک رائے یہ بھی منقول ہے کہ چہرے پر آنے والے زخم کا تاوان سر پر آنے والے زخم سے دوگنا ہوگا۔ کیونکہ سر کی بہ نسبت چہرے کا زخم زیادہ موجب عار ہوتا ہے۔ سر کا زخم بالوں کے نیچے چھپ سکتا ہے لیکن چہرے کا ظاہر ہوتا ہے[3]۔ امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک موضحہ خواہ سر میں ہو یا چہرے پر اس میں مقررہ تاوان سے زیادہ کچھ واجب نہیں۔ لیکن امام مالکؒ کا مشہور قول یہ ہے کہ سر اور چہرے کا زخم اگر بھر جانے کے باوجود بدنما دکھائی دے تو مقررہ تاوان کے علاوہ مجرم سے، اس بدصورتی کے بدلے منصفانہ تاوان بھی لیا جائے گا[4]۔

۲۔ ہاشمہ میں دس اونٹ واجب ہیں۔ ہاشمہ میں دس اونٹوں کا تقرر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول نہیں بلکہ یہ حضرت زیدؓ بن ثابت سے مروی ہے۔ نیز امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد اس بات کے قائل ہیں کہ زخم

---

[1] الشرح الکبیر، ج ۹ ص ۶۱۹۔

[2] الکاسانی، ج ۷ ص ۳۱۶۔ لکھتے ہیں: "اگر موضحہ بھر جائے لیکن اس کے آثار باقی ہوں تو اس میں ۵ اونٹ معاوضہ ہے۔ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے"۔ ——— تبیین الحقائق شرح الکنز، زیلعی، ج ۶ ص ۱۳۲، ۱۳۳۔ لکھتے ہیں "موضحہ میں دیت کا ۱/۲۰ واجب ہے"۔ ——— المہذب، ج ۲، ص ۲۱۲-۲۱۳ ——— الشرح الکبیر، ج ۹ ص ۶۲۱ اور اس کے بعد۔

[3] الشرح الکبیر ج ۹ ص ۶۲۱

[4] مواہب الجلیل شرح مختصر خلیل، ج ۶ ص ۲۵۹ لکھتے ہیں کہ موضحہ زخم اگر بھر آئے اور موجب عار ہو تو اس کے بارے میں تین اقوال ہیں۔ مالک اور ابن قاسم کا یہ قول مشہور رہے کہ اس میں عار کے مطابق مقررہ تاوان پر منصفانہ اضافہ کیا جائے گا۔

کی اس قسم کا تعلق سر اور چہرے سے ہے۔ امام مالکؒ یہ فرماتے ہیں کہ ہاشمہ سر اور چہرے کے ماسوا جسم کے دوسرے حصے میں ہوتا ہے۔ امام مالکؒ اس کی جگہ سر اور چہرے میں منقلہ کو رکھتے ہیں[1]۔

۳۔ منقلہ کا تاوان ۱۵ اونٹ ہوتے ہیں۔ عمرو بن حزم کے مکتوب میں یہ تعداد نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے[2]۔

۴۔ آمہ میں دیت کا 1/3 حصہ واجب ہے، یہ بھی عمرو بن حزم کے مکتوب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے۔ نیز عکرمہ بن خالد سے منقول ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے آمہ میں دیت کے 1/3 حصے کا فیصلہ دیا[3]۔

۵۔ دامغہ میں بھی دیت کا 1/3 واجب ہے، بعض شوافع و حنابلہ یہ کہتے ہیں کہ 1/3 تو اس حصے میں واجب ہے جو آمہ کے مساوی ہے اور اس سے جو زخم زیادہ ہے اس میں منصفانہ معاوضہ واجب ہے کیونکہ دامغہ میں آمہ سے زیادہ دماغ کی باریک جلد بھی پھٹ جاتی ہے[4]۔

یاد رہے کہ امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ موضحہ، ہاشمہ، منقلہ اور آمہ زخم اگر اس طرح بھر آئیں کہ متضرر کے جسم پر کوئی داغ نہ رہے تو ان میں کچھ واجب نہ ہوگا۔ امام ابو یوسف فرماتے ہیں کہ ان میں منصفانہ معاوضہ کی صورت میں غیر مقرر تاوان ہوگا اور امام محمد صرف علاج معالجے کے اخراجات کے قائل ہیں[5]۔ (باقی)

---

[1] الکاسانی، ج ۷، ص ۳۱۶، لکھتے ہیں: "اگر زخم بھر آئے اور اس کا اثر باقی ہو تو ہاشمہ میں 1/10 دیت واجب ہے"۔ تبیین الحقائق شرح الکنز زیلعی، ج ۶ ص ۱۳۲، ۱۳۳: "ہاشمہ میں دیت کا 1/10 ہے"۔ المہذب، ج ۲ ص ۲۱۳۔ الشرح الکبیر ج ۹ ص ۶۲۵-۶۲۶۔

[2] الکاسانی، ج ۷، ص ۳۱۶: "جب زخم بھر آئے اور اس کا اثر باقی ہو تو منقلہ میں بس ۱۵ اونٹ ہیں، یہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے"۔ تبیین الحقائق شرح الکنز زیلعی، ج ۶ ص ۱۳۲، ۱۳۳: "منقلہ میں دیت کا 1/10 اور 1/20 حصہ واجب ہے"۔ المہذب، ج ۲ ص ۲۱۳۔ الشرح الکبیر ۹ ص ۶۲۷۔

[3] الکاسانی ج ۶ ص ۳۱۶: "اگر زخم بھر آیا اور جسم پر داغ رہ گیا تو آمہ میں دیت کا 1/3 حصہ واجب ہے۔ یہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے"۔ تبیین الحقائق شرح الکنز زیلعی ج ۶ ص ۱۳۲، ۱۳۳: "آمہ میں دیت کا 1/3 واجب ہے"۔ المہذب، ج ۲ ص ۲۱۳۔ الشرح الکبیر ج ۹ ص ۶۲۷، ۶۲۸۔

[4] البدائع ج ۷، ص ۳۱۶۔ المہذب ج ۲ ص ۲۱۳۔ الشرح الکبیر ج ۹ ص ۶۲۸۔

[5] الکاسانی ج ۷، ص ۳۱۶۔

رسائل و مسائل

"خلافتِ معاویہؓ و یزید"

سوال: مولانا مودودی کی کتاب "خلافت و ملوکیت" پر تو خوب لے دے ہو رہی ہے اور اس سلسلے کے بعض سوالات کا جواب آپ نے بھی دیا ہے مگر اس موضوع سے متعلق جو کتابیں محمود احمد عباسی اور ان کے بھتیجے علی احمد عباسی نے لکھی ہیں، تعجب ہے کہ ان میں اہلِ سنت کے مسلک و عقیدہ کو جس طرح مسخ کیا گیا ہے اور حضرت علیؓ اور حضرت حسینؓ کے بالمقابل امیر معاویہؓ اور یزید کی شخصیت کو جس طرح بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا ہے۔ اس کی تردید کسی نے ضروری نہیں سمجھی۔ تردید کیا معنی ان کتابوں کے مواد کو کسی نہ کسی صورت میں دوسرے حضرات نے اپنی تصانیف اور تحریروں میں سمو دیا ہے، حتیٰ کہ ایک کتاب "سیدنا معاویہ، شخصیت و کردار" کے بارے میں تو عباسی صاحب کو یہ شکایت کرنی پڑی ہے کہ اس کے مؤلف نے ان کے بھتیجے کی کتاب "حضرت معاویہؓ کی سیاسی زندگی" کو سامنے رکھ کر اپنی کتاب مرتب کر ڈالی ہے، قدرے تغیر کے ساتھ مضمون بھی وہی، عنوانات بھی وہی ہیں۔

"حضرت معاویہؓ کی سیاسی زندگی" اور "خلافتِ معاویہؓ و یزید" تو غالباً ضبط ہو چکی ہیں مگر ان سے ملتی جلتی عباسی صاحب کی ایک دوسری کتاب "تحقیقِ مزید" کے نام سے چھپ گئی ہے۔ اگر یہ کتاب آپ کی نظر سے نہ گزری ہو، تو اسے بھی دیکھیں۔ اس میں دو سو بہتر صحابہ کرام اور پانچ ازواجِ مطہراتؓ کے بارے میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ ان میں سے کسی ایک کی مخالفت یا خروج یزید کے خلاف ثابت نہیں، گویا یہ سب یزید کی ولی عہدی اور خلافت کی بیعت میں داخل تھے۔ صرف امام حسینؓ اور حضرت ابن زبیرؓ نے خروج کیا۔ کیا یہ واقعات کی صحیح تصویر ہے اور کیا ان دو حضرات کو چھوڑ کر باقی سب نے یزید کی بیعت برضا و رغبت قبول کر لی تھی؟

اس سلسلے میں ایک اور واقعہ تحقیق طلب ہے۔ "خلافت و ملوکیت" اور دوسری تاریخوں میں بالعموم یہ بیان کیا گیا ہے کہ حضرت عمارؓ بن یاسر حضرت علیؓ کے ہمراہ جنگ صفین میں شریک تھے اور امیر معاویہؓ کے لشکریوں کے ہاتھوں شہید ہوئے اور اسی بنا پر حضرت عمارؓ کے متعلق ارشاد نبویؐ تقتلك فئة باغية میں باغی گروہ کا اطلاق امیر معاویہؓ اور ان کے ساتھیوں پر کیا جاتا ہے لیکن محمود عباسی صاحب نے حضرت عمار کی جنگ صفین میں شرکت کی تردید کی ہے اور اپنی کتاب حقیقتِ خلافت و ملوکیت ص۱۸۱ پر لکھا ہے کہ جو حقیقت ہے وہ خود طبری کی روایت سے منکشف ہے کہ حضرت عمار کو بلوائیوں نے مصر میں مدینہ پہنچنے سے پہلے ہی قتل کر دیا (وقد اغتیل) صحیح صورت واقعہ کی مزید وضاحت درکار ہے۔

جواب - (از ملک غلام علی صاحب)۔ خوارج اور بعض معتزلہ کے ماسوا پوری امتِ مسلمہ اور علمائے اہلِ سنت میں سلف سے خلف تک اس امر پر ہمیشہ اجماع رہا ہے کہ حضرت علیؓ مسلمانوں کے چوتھے اور آخری خلیفۂ راشد تھے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی کے بموجب ان پر خلافتِ راشدہ کا خاتمہ ہو گیا۔ حضرت امیر معاویہؓ کو بعض اہلِ علم نے صاف طور پر امام جائر اور حضرت علیؓ کے بالمقابل باغی و خاطی کہا ہے، حتیٰ کہ نسبتِ فسق تک کی ہے اور بعض نے حضرت علیؓ کے خلاف اُن کے نزاع و قتال کو خطائے اجتہادی سے تعبیر کیا ہے۔ امیر معاویہؓ کی خلافت کا انعقاد خلافتِ علیؓ کی موجودگی میں تو ہو ہی نہیں سکتا تھا حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد بھی ان کی خلافت اس وقت سے تسلیم کی گئی جب حضرت حسنؓ نے ان سے مصالحت کر لی اور خلافت سے دستبردار ہو گئے۔ اس وقت امیر معاویہؓ کی خلافت منعقد تو ہو گئی مگر خلافتِ راشدہ کا درجہ اسے پھر بھی حاصل نہ ہو سکا۔ بہر حال کوئی وجہ تو تھی کہ ان کی صحابیت کے باوصف اور ان کو فقیہ و مجتہد قرار دینے کے باوجود علمائے اہلِ سنت نے کبھی ان کا شمار خلفائے راشدین میں نہیں کیا اور انہیں ایک بادشاہ ہی کہا۔

پھر اپنے عہدِ خلافت میں حضرت معاویہؓ نے اپنے بیٹے یزید کو ولی عہد بنایا۔ یہ محض ایک جانشینی کی تجویز یا مشورہ نہیں تھا بلکہ بیٹے کو تختِ خلافت کا باقاعدہ وارث نامزد کر کے اس کی ولی عہدی کے حق میں پوری مملکت کے طول و عرض میں بیعتِ عام حاصل کرنے کی کوشش کی گئی اور اس کے لیے حکومت کی طاقت و سطوت اور ذرائع

وسائل کو کام میں لایا گیا۔

اس فعل کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ جو بات کہی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اس کی وجہ محض باپ کی بیٹے سے محبت نہ تھی، بلکہ اس میں مسلمانوں کی خیر خواہی کا جذبہ پنہاں تھا لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا خلفائے راشدین کی سنّت میں اس بات کی کوئی دلیل یا نظیر نہیں ملتی کہ مسلمانوں کا امیر یا خلیفہ اپنے کسی قرابت دار کو اپنی زندگی ہی میں ولی عہد مقرر کرے اور اپنی بیعت کے ساتھ ایک دوسری بیعت کا علاوہ بھی ہر مسلمان کے گلے میں ڈال دے اور امت کو ایک پیشگی عہد اطاعت کا پابند بنانے کی سعی کرے۔ نیز یہ بھی ایک ناقابلِ انکار تاریخی حقیقت ہے کہ حضرت معاویہؓ کے اس فعل کے بعد یہ بات ایک سنتِ جاریہ اور عادتِ مستمرہ کی حیثیت اختیار کر گئی کہ خلیفہ اپنی زندگی ہی میں اپنے خاندان کے کسی فرد کو ولی عہد مقرر کر دے اور اس کی بیعت لے لے۔ اس سے مسلمانوں میں انتخابی خلافت کا طریقہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا اور اس کی جگہ بادشاہت یا آمریت نے لے لی۔ جہاں تک یزید کا تعلق ہے، بعض علمائے اہلِ سنت نے اب تک اس کے دفاع میں جو کچھ کہا ہے وہ بس اس حد تک ہے کہ "اسے کافر کہنا اور اس پر لعنت کرنا جائز نہیں۔ وہ ایک مسلمان حکمران تھا۔ ولایتِ عہد کے وقت تک اس کا فسق و فجور کسی کے علم میں نہ تھا اور امام حسینؓ کا قتل اس کے ایماء پر نہیں ہوا، اگرچہ اس نے قاتلین حسینؓ سے باز پرس بھی ضروری نہیں سمجھی۔" اس سے آگے بڑھ کر علمائے اہلِ سنت میں سے کسی نے بھی کوئی بات یزید کے حق میں نہیں کہی ہے۔

اب اہلِ سنت کے اس اجماعی مسلک اور ان متفق علیہ تصریحات سے بالکل برعکس اور عین ضد میں ایک نیا موقف ہے جسے محمود عباسی صاحب نے اختیار کیا ہے۔ انہوں نے حضرت علیؓ کی خلافت کے انعقاد ہی کو سرے سے مشتبہ بنانے کی سعی ناکام کی ہے تاکہ ان کا خلیفہ راشد ہونا اور اپنے مخالفین کے مقابلے میں برسرِ حق یا کم از کم اولیٰ بالحق ہونا ہی مشکوک ہو جائے۔ پھر جب نوبت یزید تک پہنچی ہے تو یہاں آ کر عباسی صاحب کی دیدہ دلیری اور خیرہ چشمی اپنی آخری حد کو پہنچ گئی ہے۔ ان کے نزدیک "امیر المومنین یزیدؒ کی خلافت پر جیسا اجماعِ امت ہوا ہے ایسا اجماع حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کو بھی نصیب نہیں ہوا تھا" اور ان کے بقول:

"صحابہ و تابعین، ہاشمی اور اموی اکابرین سب نے ہر دلعزیز ولی عہد کی بیعتِ خلافت خوشدلی

کے ساتھ کی۔ البتہ مسند نشینی کی خبر سنتے ہی دونوں طالبانِ خلافت، حضرت حسینؓ و ابن الزبیرؓ کسی سوچی سمجھی اسکیم کے مطابق گورنر مدینہ کو چکمہ دے کر اٹھ کھڑے ہوتے۔ ان کا یہ طرزِ عمل اس بات کی بین دلیل ہے کہ موتِ معاویہؓ کا انتظار ہو رہا تھا: (تحقیق مزید ص ۲۳۱)

ہٹ دھرمی کا کمال یہ ہے کہ امام حسینؓ کے سرفروشانہ اور مجاہدانہ اقدام کو عباسی صاحب نے "امیر یزید" کی خلافت کے خلاف باغیانہ خروج قرار دیا ہے اور ابن خلدون نے یزید اور اس کی ولایتِ عہد کے متعلق ہر ممکن صفائی پیش کرنے کے باوجود چونکہ یزید کے فسق و فجور کو صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے اور ابن العربی کے اس قول کو غلط قرار دیا ہے کہ امام حسینؓ کا قتل شرعاً جائز تھا کیونکہ وہ یزید کے بالمقابل مدعیٔ خلافت تھے، اس لیے عباسی صاحب کہتے ہیں کہ:

"ابن خلدون نے حضرت حسینؓ کے اقدام خروج پر جہاں گفتگو کی ہے، وہاں ان کی پوزیشن کو صاف (یعنی داغدار؟) کرنے کی کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ انہوں نے ولیعہدی کی بیعت کے سلسلہ میں تو بہت اچھی بحث کی ہے، جسے کتاب "خلافتِ معاویہؓ و یزید" میں نقل کرتے ہوئے تحسین بھی کی گئی لیکن اقدامِ خروج کا حقیقت پسندانہ جائزہ لینے میں شاید عقیدتِ حسینؓ ان کے مانع آئی۔ عقیدت کی بات اور ہے اور وقائع تاریخی کی بےلاگ ریسرچ شئے دیگر است"۔

(تحقیقِ مزید ص ۲۴۲)

اس "ریسرچ شئے دیگر است" کے نادر نمونے عباسی صاحب کی تحریروں میں جابجا بکھرے ہوئے ہیں۔ معروف دو طالبانِ خلافت کے ماسوا پوری امتِ مسلمہ نے ہر دلعزیز ولی عہد کی بیعت جس بے قراری کے ساتھ کی، اس کا ثبوت فراہم کرنے کے لیے عباسی صاحب نے "تحقیقِ مزید" میں ایک باب "صحابۂ رسول اللہ صلعم اور یزیدؒ کی بیعت ولیعہدی و خلافت" کے نام سے رقم کیا ہے اور سو سے زائد صفحات میں ان تمام صحابۂ کرام اور امہات المومنین کے اسماء و تراجم بیان کر دیئے ہیں جو یزید کی ولی عہدی کے وقت زندہ تھے اور جن کے حالات مؤلف کو مل سکے ہیں گویا ان اصحاب کا بقیدِ حیات ہونا اور بیعتِ یزید کے وقت دنیا سے اٹھ نہ جانا بجائے خود اس امر کا زندہ ثبوت ہے کہ انہوں نے پوری خوشدلی اور آمادگی کے ساتھ لپک کر یزید کے دستِ حق پرست پر بیعت کر لی تھی۔

عباسی صاحب نے فقط ان حضرات کے نام گنوانے پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ احادیثِ صحیحہ کا مفہوم مسخ کرنے اور واقعاتِ ثابتہ کا حلیہ بگاڑنے میں بھی کوتاہی نہیں کی۔ اس کوشش کا ایک نمونہ میں یہاں پیش کیے دیتا ہوں جس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ تاریخی واقعات بیان کرنے میں عباسی صاحب نے کیسی دیانت سے کام لیا ہے۔ ام المومنین حضرت حفصہؓ کے حالات میں لکھتے ہیں:

"یہ محترم خاتون امیر یزیدؒ کے زمانۂ ولی عہدی میں حیات تھیں۔ صحیح بخاری میں بیان کیا گیا کہ اپنے بھائی حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو ہدایت کی کہ اس مجلس میں فوراً شریک ہوں جس کے لیے ان کو بلایا جا رہا تھا، ایسا نہ ہو کہ عدمِ شرکت کی بنا پر کوئی صورت اختلاف کی پیدا ہو۔ ..... یہ معاملہ تحکیم ثالثی کا نہ تھا بلکہ امیر یزیدؒ کی ولی عہدی کا مسئلہ تھا۔ حضرت ابن عمرؓ نے امیر یزید کی ولیعہدی اور خلافت کی بیعت بلا تذبذب کی تھی۔ ان کے اس عمل سے ان کی محترم بہن کے موقف پر بھی روشنی پڑتی ہے۔"

اس طرح بخاری کے حوالے سے یہ باور کرانے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ دونوں بہن بھائی "امیر المؤمنین" کی بیعت کے لیے سخت بے چین اور بے تاب تھے۔ دوسرے مقامات پر بالعموم عباسی صاحب کتابوں کے صفحات کا حوالہ دے دیتے ہیں لیکن یہاں انہوں نے بخاری کی کتاب، باب یا صفحے کا حوالہ نہیں دیا۔۔۔ بہرکیف یہ حدیث بخاری کتاب المغازی، باب غزوۂ خندق میں موجود ہے اور اس کا متن اور ترجمہ درج ذیل ہے:

عن ابن عمر قال دخلت على حفصة و	حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں حضرت حفصہؓ کے ہاں
نسواتها تنطف، قلت قد كان من امر الناس	گیا۔ وہ نہائی تھیں اور پانی ان کے بالوں سے ٹپک رہا تھا
ما ترين فلم يجعل لي من الامر شيء فقالت	میں نے ان سے کہا کہ لوگوں کا حال تو آپ دیکھ رہی ہیں
الحق فانهم ينتظرونك واخشى ان يكون في	مگر میرا تو امارت سے کوئی سروکار نہیں رہنے دیا گیا۔ حفصہؓ
احتباسك عنهم فرقة فلم تدعه حتى ذهب	بولیں: آپ جائیں، لوگ آپ کے منتظر ہیں اور میں ڈرتی
فلما تفرق الناس خطب معاوية قال مَن	ہوں کہ آپ کے وہاں نہ جانے سے پھوٹ پڑ جائے گی۔
كان يريد ان يتكلم في هذا الامر فليطلع لنا قرنه	غرض حضرت حفصہؓ نے انہیں اس وقت تک نہ چھوڑا

ولنحن احق به منه ومن ابیه قال حبیب بن
مسلمة فهلا اجبته قال عبدالله فحللت
حبوتی وهممت ان اقول احق بهذا الامر منك
من قاتلك واباك علی الاسلام فخشیت ان
اقول کلمة تفرق بین الجمع وتسفك الدم
ویحمل عنی غیر ذالك فذکرت ما اعد الله
فی الجنان قال حبیب حفظت وعصمت۔

جب تک وہ مجمع میں چلے نہ گئے۔ جب لوگ الگ الگ ہو گئے تو امیر معاویہؓ نے تقریر میں کہا کہ جو شخص اس امارت یا بیعت کے معاملے میں کچھ کہنے کا ارادہ رکھتا ہے وہ ذرا اپنا سینگ تو اونچا کرے ہم اس سے اور اس کے باپ سے زیادہ امارت کے حقدار ہیں۔ حبیب بن مسلمہ نے پوچھا کہ آپ نے اس کا جواب نہ دیا؟ حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا کہ میں نے اپنی چادر اتاری اور ارادہ کیا کہ امیر معاویہ سے کہوں کہ تم سے زیادہ حقدار امارت کا وہ ہے جس نے تم سے اور تمہارے باپ سے اسلام کی خاطر لڑائی کی۔ پھر مجھے اندیشہ ہوا کہ میری بات سے تفرقہ پیدا ہوگا، خونریزی کی نوبت آئے گی اور میری بات سے کچھ اور ہی مفہوم لیا جائے گا۔ پس میں نے ان نعمتوں کی یاد دل میں تازہ کی جو اللہ نے جنت میں تیار کی ہیں اور خاموش رہا۔ حبیب کہنے لگے کہ آپ محفوظ رہے اور بچ گئے۔

اب اس روایت کے تیور اور انداز بیان کو دیکھیے اور عباسی صاحب اس سے جو مطلب نچوڑنا چاہتے ہیں اسے بھی دیکھیے۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ یہاں تحکیم کے بجائے یزید کی ولی عہدی زیر بحث ہے، تب بھی اس مکالمہ کے الفاظ صاف طور پر بتا رہے ہیں کہ بیعت ولی عہدی کا معاملہ جس طرح سے طے کیا جا رہا تھا حضرت عبداللہ ابن عمر اس پر غیر مطمئن اور رنجیدہ تھے لیکن آپ چونکہ طبعاً جھگڑوں اور فتنوں سے دامن بچا کر رکھنا چاہتے تھے اور آپ کے والد ماجد نے بھی آپ کو امیدداری خلافت سے روک دیا تھا، اس لیے آپ اس مجمع میں حاضر ہونا پسند نہیں فرماتے تھے جس میں امیر معاویہؓ کی تقریر کا پروگرام تھا لیکن حضرت حفصہؓ نے انہیں باصرار وہاں جانے پر آمادہ کیا کیونکہ وہاں ان کی غیر حاضری کو محسوس کیا جا رہا تھا اور حضرت حفصہؓ کا خیال یہ تھا کہ ان کے جانے سے کچھ تو فائدہ ہوگا اور فساد دبے گا بہرکیف حضرت عبداللہ بن عمر اس مجلس میں تشریف لے گئے۔ اس کے بعد امیر معاویہؓ نے تقریر فرمائی اور تہدید آمیز

انداز میں کہا کہ "جو شخص میرے یا میرے بیٹے کے خلاف لب کشائی کی جرأت رکھتا ہے۔ وہ یہاں ذرا سر اٹھا کر دیکھے تو سہی، ہم اس سے اور اس کے باپ سے زیادہ خلافت کے حقدار ہیں۔ محدثین کے بیان کے مطابق یہاں حضرت عبداللہ ابن عمرؓ، حضرت حسین ابن علیؓ اور حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ کے خلاف طعن و تعریض اور ان پر اپنی فوقیت جتانا مقصود تھا جسے حضرت ابن عمر جیسے متحمل اور مصالحت پسند بزرگ بھی مشکل ہی سے برداشت کر سکتے تھے چنانچہ ان کے جی میں آیا کہ وہ یہ کہیں کہ جناب آپ سے زیادہ خلافت کے مستحق وہ ہیں جنہوں نے آپ کے اور آپ کے والد ابوسفیان کے خلاف قتال کیا جب کہ آپ دونوں کفر کی حالت میں ہمارے خلاف برسرِ پیکار تھے مگر آپ یہ بات کہتے کہتے صرف اس خطرے کی بنا پر رک گئے کہ میری اس بات کو طلبِ خلافت کے معنی پہنائے جائیں گے اور جو لوگ بزورِ شمشیر اس مسئلے کو طے کر رہے ہیں وہ برافروختہ ہو کر مزید خون خرابہ کریں گے۔

یہ واقعہ تو حضرت ابن عمرؓ کا ہوا۔ اسی سے ملتا جلتا ایک دوسرا واقعہ بھی بخاری (تفسیر الاحقاف) میں روایت کیا گیا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے مروان کو مدینے کا گورنر بنایا۔ اس نے اپنے ایک خطبے میں یزید کی ولیعہدی کا ذکر شروع کیا تو عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ نے اس پر اعتراض کیا۔ مروان کہنے لگا "پکڑو اسے" عبدالرحمٰنؓ نے بھاگ کر حضرت عائشہؓ کے گھر میں پناہ لی۔ مروان نے وہاں تک پیچھا کیا اور حضرت عائشہؓ کے ساتھ بھی تلخ کلامی کی۔

یہ بات اپنی جگہ پر درست ہے کہ حضرت علیؓ سے لے کر عبدالملک بن مروان کے عہد تک جتنی بھی لڑائیاں جھگڑے ہوتے ان سے حضرت عبداللہ بن عمر الگ تھلگ رہے اور حضرت علیؓ کے بعد جس نے بھی خلافت پر قبضہ کر لیا، اس کی حکومت کو جس طرح دوسرے مسلمانوں نے چار و ناچار تسلیم کر لیا، اسی طرح آپ نے بھی کر لیا۔ لیکن یہ کہنا دراصل حقائق کا منہ چڑانا ہے کہ حضرت ابن عمرؓ یا دوسرے کبار صحابہ و تابعین نے بطیبِ خاطر ان متغلبین کی اطاعت قبول کی تھی۔

حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں حدیث بالا کی شرح کرتے ہوئے صاف لکھا ہے کہ حضرت ابن عمرؓ کی رائے یہ تھی:۔

انہ لا یبایع المفضول الا اذا خشی الفتنۃ — افضل کے مقابلے میں مفضول کی بیعت جائز نہیں، الا یہ

ولھذا بایع بعد ذالک معاویۃ ثم ابنہ یزید — کہ فتنے کا خدشہ ہو۔ اسی لیے حضرت ابن عمرؓ نے حضرت

ونهى بنيه عن نقض بيعته وبايع بعد ذلك لعبد الملك بن مروان۔

علیؓ کے بعد حضرت معاویہؓ کی اور پھر ان کے لڑکے یزید کی بیعت کی اور اپنے بیٹوں کو اس کی بیعت توڑنے سے روکا اور اس کے بعد عبدالملک بن مروان کی بھی بیعت کی۔

محمود عباسی جیسے لوگ جو ہر "امیر المؤمنین" کے آگے دیدہ و دل فرشِ راہ کرنے پر آمادہ و مستعد رہتے ہیں، وہ بیچارے اپنے اُوپر اِن سلفِ صالحین کو بھی قیاس کرتے ہیں۔ عباسی صاحب کی باطنی کیفیت کا عکس ان کی درج ذیل تحریر میں دیکھا جا سکتا ہے:

"امتِ مسلمہ اُسوۂ عثمانی سے سبق حاصل کرتی تو طلبِ خلافت کی خونریزیوں سے اسلامی ریاست کے خد و خال اس درجہ مسخ نہ ہوتے جن کا قدرے اندازہ مسلسل خروجوں کے حالات سے ہوگا۔ اسلامی تاریخ میں شاید یہی ایک قابلِ تقلید مثال مفاداتِ امت کے پیشِ نظر بغیر خونریزی کے سیاسی انقلاب پیدا کرنے کی ہے جو فیلڈ مارشل محمد ایوب خان اور ان کے ساتھیوں کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے ان حضرات کو کہ کسی طرح اُسوۂ عثمانی پر عمل تو ہو سکا۔"

(تحقیق مزید ص ۲۳۸)

ظاہر ہے کہ جس "محقق" کی چشمِ بینا کو پوری اسلامی تاریخ میں یہی ایک قابلِ تقلید مثال نظر آئی ہو، اُس سے اگر مقامِ حسین مخفی رہے اور یزید اُسے "ہر دلعزیز امیر المؤمنین" نظر آئے تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہونی چاہیے ؎

گر نہ بیند بروز شپّرہ چشم
چشمۂ آفتاب را چہ گناہ؟

حضرت عمارؓ بن یاسرؓ کا جنگِ صفین میں حضرت علیؓ کا ساتھ دینا اور امیر معاویہؓ کے لشکر کے ہاتھوں شہید ہونا ایک قطعی الثبوت واقعہ ہے جو تاریخ کی کتابوں ہی میں نہیں بلکہ کتب حدیث میں بھی مذکور ہے۔ تمام مؤرخین و محدثین نے اسے بالاتفاق تسلیم کیا ہے۔ بلکہ مُسند احمد اور دیگر کتب میں یہ واقعہ بھی بہ سند بیان ہوا ہے کہ حضرت عمارؓ کی شہادت کی خبر دے کر امیر معاویہ کو تقتلك الفئة الباغية والی حدیث بھی سنائی گئی اور بعض روایات

میں حضرت معاویہؓ کا یہ عجیب جواب بھی مذکور ہے کہ ہم نے انہیں قتل نہیں کیا بلکہ ان کے قتل کا اصل باعث علیؓ ہیں جو انہیں ساتھ لائے۔ محمود عباسی اولین شخص ہیں جنہوں نے اس واقعہ کا انکار کیا ہے اور یہ بات تصنیف کی ہے کہ عمارؓ تو دو سال پہلے مصر میں ہلاک کر دیئے گئے تھے۔ اس دروغ بافی کا تانا بانا علامہ ابن جریر طبریؒ کے صرف ایک فقرے سے تیار کیا گیا ہے جو انہوں نے اس سلسلۂ بیان میں لکھا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے حضرت عمارؓ کو اہلِ مصر کی شکایات کی تحقیق کے لیے مصر بھیجا تھا اور وہاں" انہیں لوگوں نے اتنا عرصہ روکے رکھا کہ یہ گمان کیا جانے لگا کہ انہیں دھوکے سے مار ڈالا گیا ہے"۔

ویسے تو عباسی صاحب طبری کو ہر جگہ رافضی لکھتے ہیں لیکن مطلب برآری کے لیے ان کے ہاں شیعہ، عیسائی، یہودی، دہریہ ہر شخص ثقہ بن جاتا ہے اور اگر کسی شخص کے قول سے وہ مطلب نکلتا نظر نہ آتا ہو، جو عباسی صاحب کو پسند ہو، تو وہ اس قول کو چھیل بنا کر اور اپنی تحقیق انیق کے خراد پر چڑھا کر حسبِ منشا صورت میں ڈھال لینے میں بڑے ماہر ہیں۔ طبری کا اصل فقرہ یہ ہے: واستبطأ الناس عماراً حتی ظنوا انہ اغتیل بس لوگوں کے اس گمان کو بنیاد بنا کر جھوٹ کا یہ محل تعمیر کیا گیا ہے کہ عمارؓ تو مصر میں قتل کر دیئے گئے تھے۔

عباسی صاحب نے "سیدنا معاویہؓ، شخصیت و کردار" کے مصنف کے بارے میں یہ شکایت تو کی ہے کہ انہوں نے ان کے بھتیجے کی کتاب کا سارا مواد اپنی کتاب میں بلا حوالہ و بلا اجازت جذب کر لیا ہے، مگر یہ میرے نزدیک ایک شکوۂ بے جا ہے۔ ان کے اپنے بیان کے مطابق حکیم محمود احمد ظفر کراچی میں ان سے کئی بار ملے اور اپنا عندیہ ان پر ظاہر کرتے رہے۔ انہوں نے عباسی صاحب اور ان کے بھتیجے کی کتاب کا مواد لینے کی اجازت مانگی جو انہیں شوق سے دی جاتی رہی کیونکہ عباسی صاحب کے بقول ان کا مقصد تو "تحریک کی اشاعت ہے"۔ اس کے بعد جب حکیم محمود احمد نے دیکھا کہ اصل کتابیں ضبط ہیں اور ان کے مضامین کا بلا حوالہ سرقہ کر لیا جائے تو قارئین کو مشکل ہی سے حقیقت حال کا علم ہوگا، تو حکیم صاحب نے اس مواد کو اپنے نام سے چھاپ دیا۔ آخر ان کا مقصد بھی تو اسی تحریک کی اشاعت ہے جسے عباسی صاحب نے چلا رکھا ہے۔

(بقیہ اشارات)

کی تعبیات سے بغاوت کا درس دیتے ہیں؟

ممکن ہے کہ ہماری ان گزارشات کے بارے میں کوئی نام نہاد ماہرِ تعلیم یہ کہے کہ تعلیم کا مقصد تو نوجوانوں کو آزادیٔ فکر کی تربیت دینا اور حقائق سے آگاہ کرنا ہے، اور تم جس انداز کا نظامِ تعلیم مرتب کرنے کا مشورہ دے رہے ہو اس سے ان کے اندر تنگ نظری پیدا ہو گی اور طلبا حقائق سے آشنا ہونے کے بجائے ایک خاص نوعیت کے افکار اور رجحانات کے پابند ہو جائیں گے اور زندگی کے سارے معاملات کو ایک خاص عینک سے دیکھنے کے عادی بن جائیں گے۔ مگر یہ محض خام خیالی ہے۔ ہم اس حقیقت کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ تعلیم اور پراپیگنڈے میں نمایاں فرق ہے۔ تعلیم کا حقیقی مقصد حقائق کا صحیح شعور و عرفان ہی ہے۔ مگر ہم یہ بات سمجھنے سے بہر حال قاصر ہیں کہ آخر یہ کیوں فرض کر لیا گیا ہے کہ حقائق وہی ہیں جنہیں اہل مغرب یا اشتراکی ممالک حقائق کے طور پر پیش کرتے ہیں اور ان کے ماسوا زندگی کی جتنی بڑی حقیقتیں ہیں وہ سب اوہام ہیں مثلاً اگر یہ کہا جائے کہ زندگی کے محرکات صرف مادی ہیں تو اسے حقیقت کا بیان سمجھا جائے، لیکن وسیع تجربے اور عمیق مشاہدے کی تائید سے بھی اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ زندگی کے اصل محرکات روحانی اور اخلاقی ہیں تو ان پر تاریک خیالی کی پھبتی کس کر فوراً مسترد کر دیا جائے۔ اسی طرح اگر یہ کہا جائے کہ کائنات کا پورا نظام اور انسان کا اخلاقی احساس اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ یہ کارخانہ قدرت کسی برتر ذات کی قدرت کا ملہ کا نتیجہ ہے تو زندگی کی اس ناقابلِ تردید اور واضح حقیقت کو یہ کہہ کر ماننے سے انکار کر دیا جائے کہ یہ ذات ہمارے محسوسات سے ماوراء ہے، مگر اس احمقانہ بات کو حقیقت کے طور پر تسلیم کرنے پر زور دیا جائے کہ کائنات کا یہ وسیع و عریض کارخانہ بغیر کسی خالق کے معرض وجود میں آگیا ہے اور اب کسی مدبر کی تدبیر کے بغیر خود بخود چل رہا ہے۔ اس ضمن میں سب سے پہلے تو دیکھنا چاہیے کہ اسلام نے جن حقائق سے انسان کو آشنا کیا ہے آیا اصل حقائق وہ ہیں یا جن اوہام کو اہلِ مغرب یا اشتراکی فلاسفہ حقائق مانتے ہیں وہ واقعی صداقتیں ہیں؟ اگر تعصب، تنگ نظری اور بے جا ضد اور مذہب دشمنی کو چھوڑ کر حقیقت کا کھوج لگایا جائے تو معلوم ہو گا کہ

کائنات کے اصل حقائق وہی ہیں جن کی اسلام نے بیان کیا ہے اور باقی سب جاہلانہ باتیں ہیں۔ یہ دعویٰ خود ایک مستقل موضوع ہے جس پر انشاء اللہ پھر کبھی اظہارِ خیال کیا جائے گا یہاں ہم صرف ایک دو باتیں بطور مثال پیش کرتے ہیں۔

خالقِ کائنات کی محبت اور اس کا خوف انسان کے اندر اخلاقی احساس اور ذمہ داری پیدا کرنے کا ہمیشہ ایک نہایت ہی مؤثر ذریعہ رہا ہے اور انسان نے تہذیبِ نفس کے لیے اس ذریعہ سے زیادہ کسی دوسرے ذریعہ کو مفید نہیں پایا ہے۔ اس کی اثر آفرینی پر خود انسانی فطرت گواہ ہے کیونکہ کسی بالاتر ہستی کے وجود کا احساس اس کے دل کی گہرائیوں میں ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ مگر مادہ پرست مفکرین نے اسے ذہنی عارضہ سے تعبیر کیا ہے اور انسان کو اس قسم کے "اوہام" سے نجات حاصل کرنے کی تلقین کی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انسان نے ضبطِ نفس کے بجائے نفس پرستی کا مسلک اختیار کر لیا۔ اس سلسلے میں پہلے تو داخلی پابندیوں کو ختم کیا گیا اور پھر معاشرتی اور سیاسی حدود و قیود کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر دیا گیا۔ دنیا میں آج جو ہمہ گیر فساد اور شورش برپا ہے وہ ضبطِ نفس کے داخلی محرکات کے فقدان کا طبیعی نتیجہ ہے۔ یہ نتیجہ جب رُونما ہُوا تو انسان کو کسی قاعدے کا پابند بنانے کے لیے نہایت سخت قسم کی قانونی جکڑبندیوں میں جکڑ دیا گیا، مگر یہ جکڑبندیاں بھی اب ناکام ثابت ہو رہی ہیں۔ انسان کے بارے میں یہ وہ تلخ تجربہ ہے جو ہمارے دیکھتے دیکھتے ہُوا ہے اور جس کی اس وقت پوری انسانیت تصدیق کر رہی ہے۔ اس کے بعد کیا یہ بات سمجھ میں نہیں آسکتی کہ انسانوں کی تہذیب کے لیے خارجی جکڑبندیوں سے کام نہیں چل سکتا اور اس کے لیے ناگزیر ہے کہ ان کے اندر داخلی طور پر اخلاقی احساسات کو پروان چڑھایا جائے؛ بالفاظِ دیگر کیا اب اس امر میں کسی شک کی گنجائش رہ گئی ہے کہ خدا کے خوف اور آخرت کی جوابدہی کے احساس ہی سے انسان صحیح معنوں میں انسان بنتا ہے؛

اسلام کے پیش کردہ حقائق ایسے نہیں ہیں جن کی عقل تصدیق نہ کرتی ہو۔ انسان کا شعور، اس کا داخلی

احساس، اس کا ضمیر اور ہزار ہا برس کا تجربہ اور مشاہدہ، سب ان کی صحت پر ناقابلِ تردید شہادتیں فراہم کرتے ہیں۔ اس بنا پر یہ کہنا کہ اگر ہم نے نئے نظامِ تعلیم میں اسلامی حقائق کو بنیاد بنا کر طلبا کو ان کی معرفت عطا کرنے کی کوشش کی تو ان کے اندر تنگ نظری پیدا ہو گی، بالکل غلط اور بے بنیاد ہے بلکہ ان حقائق سے متعارف ہو کر ان کے افکار میں وسعت اور توازن پیدا ہوگا اور وہ بہتر اور شاد کام زندگی کا آغاز کر سکیں گے۔

باقی صفحہ ۶۴ پر)

تصحیح

بسلسلۂ تفہیم القرآن جلد دوم، سورۂ توبہ، حاشیہ ۳۷

تفہیم کی اس جلد کے ابتدائی ایڈیشنوں میں لکھا گیا تھا کہ "۳۲ سال تک حج اپنے اصلی وقت کے خلاف دوسری تاریخوں میں ہوتا رہتا تھا اور صرف تینتیسویں سال ایک مرتبہ اصلی ذی الحجہ کی ۹۔۱۰ تاریخ کو ادا ہوتا تھا۔"

پھر طبع چہارم میں غلطی سے ۳۲ کے بجائے ۳۶ اور تینتیسویں سال کے بجائے سینتیسویں سال لکھ دیا گیا۔

اب ایک صاحب نے توجہ دلائی ہے کہ صحیح حساب کے مطابق اگر قمری سال کو شمسی سال کے برابر کرنے کے لیے تاریخیں بدل جائیں تو حج ۳۲ سال تک غلط تاریخوں میں آئیگا اور تینتیسویں یا چونتیسویں سال قریب قریب اپنی اصلی تاریخ پر آجائے گا۔ مثلاً ۱۳۵۵ھ ہجری میں ۹ ذی الحجہ ۲۰ فروری ۱۹۳۷ء کو تھی۔ اور ۳۲ سال بعد ۱۳۸۸ھ ہجری میں ۹ ذی الحجہ ۲۷ فروری ۱۹۶۹ء کو ہوئی ہے۔

ناظرین سے گزارش ہے کہ جن اصحاب کے پاس جلد دوم کا کوئی ایڈیشن ہو وہ اس کے مطابق عبارت درست کریں۔

(بقیہ: حاشیہ تفہیم القرآن)

یہ ایک الل ٹپ بنی ہوئی کائنات ہے جسے بنانے میں سرے سے کسی حکیم کی حکمت کارفرما نہیں ہے۔ پہلی صورت میں وہ ایک متناقض بات کہتا ہے کیونکہ مبنی بر حکمت کائنات میں ایک با اختیار مخلوق کا غیر ذمہ دار ہونا صریحاً خلافِ عدل و حکمت ہے۔ اور دوسری صورت میں وہ اس بات کی کوئی معقول توجیہ نہیں کر سکتا کہ ایک الل ٹپ بنی ہوئی بے حکمت کائنات میں انسان جیسی ذی عقل مخلوق کا وجود میں آنا آخر ممکن کیسے ہوا اور اس کے ذہن میں عدل و انصاف کا تصور کہاں سے آگیا۔ بے عقل سے عقل کی پیدائش اور بے عدلی سے عدل کا تصور برآمد ہو جانا ایک ایسی بات ہے جس کا قائل یا تو ایک ہٹ دھرم آدمی ہو سکتا ہے، یا پھر وہ جو بہت زیادہ فلسفہ بگھارتے بگھارتے دماغی مریض ہو چکا ہو۔

۱۲ یہ آخرت کی دوسری دلیل ہے۔ پہلی دلیل آخرت کے ضروری ہونے کی تھی، اور یہ دلیل اس کے ممکن ہونے کی ہے۔ ظاہر ہے کہ جس خدا کے لیے کائنات کا اتنا بڑا نظام بنا دینا دشوار نہ تھا اور جس کے لیے اس دنیا میں انسانوں کو پیدا کرنا دشوار نہیں ہے، اس کے لیے یہ بات آخر کیوں دشوار ہوگی کہ انسانوں کو دوبارہ پیدا کرکے اپنے سامنے حاضر کرے اور ان کا حساب لے۔

(بقیہ اشارات صـ ۶۳) ۔ ضرورت صرف صحیح عزم، خلوص اور فہم و بصیرت کی ہے۔

نظامِ تعلیم کی اس تبدیلی کے ساتھ ساتھ اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ درسگاہوں کے ماحول اور ملک کی پوری فضا کو بھی اسلام کے مطابق تبدیل کیا جائے تاکہ طلبہ جو کچھ جماعتوں میں حاصل کریں اسے درسگاہوں کے ماحول اور اجتماعی زندگی کے مختلف شعبوں میں خود اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں۔ اس مقصد کے لیے ضروری ہے کہ اس ملک کے تعلیمی اور اجتماعی معاملات ان لوگوں کے ہاتھ میں منتقل ہوں جنہیں اسلامی تعلیمات پر پختہ ایمان ہے اور جنہیں اس بات کا پوری طرح یقین ہے کہ پاکستان کی اور دنیا سے اسلام کی اور پوری انسانیت کی فلاح صرف اللہ کے دین کی پیروی میں مضمر ہے

ہماری تازہ مطبوعات

سرخ اندھیروں میں

خلیل احمد حامدی

اشتراکی ملکوں میں مسلمانوں کی حالتِ زار کا مفصل نقشہ۔

اعلیٰ ایڈیشن ۲/۷۵ روپے ـــ سستا ایڈیشن ۱/۷۵ روپیہ

اسلامی تہذیب کے چند درخشاں پہلو

ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی

لمانوں کی علمی اور تہذیبی
ٹی کی مفصل روداد۔
مغربی تہذیب کا تنقیدی جائزہ۔

اعلیٰ ایڈیشن - ۷/- روپے ـــ سستا ایڈیشن - ۴/۵۰ روپے

اقبال کا فلسفۂ خودی اور تصورِ آخرت

پروفیسر فروغ احمد

علامہ اقبال کے فلسفۂ خودی کا تحقیقی مطالعہ

اعلیٰ ایڈیشن = ۱/۵۰ روپیہ

سستا ایڈیشن = ۱/۰۰ روپیہ

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ

۱۳-ای، شاہ عالم مارکیٹ لاہور

۱۶- بیت المکرم (پہلی منزل)، ڈھاکہ